بازدید

ہندوستان و پاکستان کے افسانے

مرتبین: محمد علی صدیقی و سکرِتا پال کمار

بازدید

ہندوستان و پاکستان کے افسانے

Sarwat Aziz 1997 — Muqqadiman

Sylvat Aziz 1997 — `Muqqadiman

بازدید

ہندوستان و پاکستان کے افسانے

مرتبین
محمد علی صدیقی
سنکرِ تاپال کمار

مدیر معاون
عائشہ سلطانہ

BAZDEED
Hindustan-Wa-Pakistan Ke Afsane

ناشر

کتھا

اے-۳، سرودیا انکلیو
اروبندو مارگ، نئی دہلی-۱۱۰۰۱۷
فون: ۶۸۶۸۱۹۳، ۶۵۲۱۷۵۲
فیکس: ۶۵۱۳۳۷۳
E-mail: DELAABO5 @ giasdlo1.vsnl.net.in
Internet address: http:/ / www.katha.org

اشاعت اوّل: فروری ۱۹۹۸ء

کتھا ایک 'رجسٹرڈ نان پرافٹ' سوسائٹی ہے جو
ذوقِ مطالعہ کی نشو و نما کے لیے وقف ہے۔
کتھا ولاسم، کتھا کا افسانوی تحقیق اور وسائل کا مرکز ہے۔

جنرل سیریز ایڈیٹر: گیتا دھرماراجن
اِن ہاؤس آرٹ ڈائریکٹر: اروندر چاؤلہ
کور ڈیزائن: روما سنائی مکھرجی
آرٹ کنسلٹینٹ: پوجا سود
کوَر پکچر: شیبا چھاچی
Cleave/to, photo-text-sculpture installation
مصوری ہندوستان و پاکستان: بشکریہ آئشر گیلری
پرونکشن انچارج: ایس کنیشن
ٹائپسیٹ: نعت کمپوزنگ ہاؤس
پرنٹر: سورب پرنٹو پیک، نوئیڈا (یوپی)

Urdu Library/Short Fiction

ISBN 81-85586-77-2

اس کتاب کی اشاعت یونیسکو کے مالی تعاون سے ممکن ہو پائی ہے۔ یونیسکو ایک
بین الاقوامی ادارہ ہے جو امن کی تہذیب کا ماحول پیدا کرنے کے لیے ذہنی اشتراک
کی نشو و نما کا اقدام کرتا رہتا ہے۔ اردو کے اس پراجیکٹ کا بھی یہی مقصد
ہے کہ ایک ساجھی زبان کے ذریعے ہندو پاک کے درمیان ہمدردانہ باہمی فہم
کی فضا قائم ہو۔

تصویر کار

نلنی ملانی ۱۹۴۶ء میں کراچی میں پیدا ہوئیں۔ جے۔ جے۔ اسکول آف آرٹس، بمبئ سے فائن آرٹس میں ڈپلومہ حاصل کرنے کے بعد فنونِ لطیفہ کے مطالعہ کے لیے اسکالرشپ پر پیرس گئیں۔ واٹرکلر اور آئیل کے علاوہ فن کے دیگر ذرائع میں بھی کام کر چکی ہیں۔ ڈرامے کے فنکاروں کی بھی معاون رہی ہیں۔

رِیم سیّد رائل کالج آف آرٹ، لندن کی ایم۔ اے۔ ہیں۔ لندن، ہانگ کانگ، لاہور، اسلام آباد اور دیگر مقامات پر اُن کے کام کی نمائش ہو چکی ہے۔ آجکل لاہور میں قیام ہے۔

شیبا چھاچی ایتھوپیا میں ۱۹۵۸ء میں پیدا ہوئیں۔ دہلی، کلکتہ اور احمد آباد میں تعلیم پائی۔ فوٹو گرافر، بُت تراش اور مصنف بھی ہیں۔ آپ کا کام نسوانی شعور کی وارداتوں کا آئینہ دار ہے۔

سِلوٹ عزیز نے پہلے پاکستان میں اور پھر کینیڈا میں آرٹ میں تعلیم حاصل کی۔ آپ کے کام کی نمائشیں وسیع پیمانے پر منعقد کی جا چکی ہیں۔ ان میں سے ایک حالیہ نمائش یونیورسٹی آف کیلگری، البرٹا میں اور دوسری بریڈ فورڈ میں ہوئی۔ کینیڈا میں قیام پذیر ہیں۔

تشکر

جب یونیسکو نے کتھا سے کوئی ایسا پراجیکٹ تجویز کرنے کو کہا جس میں اردو کو ہندوستان اور پاکستان کی ساجھی زبان کی حیثیت سے دیکھا جا سکے تو ہمیں بے حد مسرت ہوئی، تاہم کام کی وسعت کے باعث ہمیں ڈر بھی محسوس ہو رہا تھا کہ اتنے کم وقت میں ہم اسے کیونکر پایۂ تکمیل تک پہنچائیں گے۔ بہرحال سکرِتا پال کمار نے یہ کام ممکن کر دکھایا ہے۔ کتھا در اصل اُن کے بغیر اسے قبول کرنے کی ہمت ہی نہ کر پاتا۔ مجھے اِس کتاب کے ایک اور ایڈیٹر ڈاکٹر محمد علی صدیقی کا بھی حبہِ دل سے شکریہ ادا کرنا ہے۔

یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ ہم سے کئیوں نے بھرپور تعاون کیا۔ ہم خاص طور پر شکر گذار ہیں:

مالی تعاون کے لیے یونیسکو کے،

اُن نقادوں اور ادیبوں کے، جنہوں نے افسانوں کے انتخاب اور حصول میں ہماری مدد کی، اور خصوصاً پروفیسر صادق کے، جنہوں نے ہر مرحلہ پر بخوشی ہمارا ساتھ دیا،

جوگندر پال صاحب اور کرشنا پال صاحبہ کے، کہ انہوں نے اس پراجیکٹ کی پرداخت میں لگاتار حصہ لیا،

لاہور اور کراچی کے ڈاکٹر وزیر آغا، ڈاکٹر انور سدید، سائرہ ہاشمی، فرخندہ لودھی، زاہدہ حنا، امراؤ طارق، فردوس حیدر اور آصف فرخی کے، جنہوں نے سکرِتا پال کمار کے قیام پاکستان کے دوران اُنہیں نہایت خندہ پیشانی سے سبھی ضروری سہولتیں فراہم کیں،

اِس کتاب کے ڈیزائن کے لیے پوجا اور روما کے اور اُن فنکاروں کے جنہوں نے ہمیں اپنی تصویروں کے استعمال کی اجازت دی،

ذاکر حسین کالج، نئی دہلی کی نغمہ، عائشہ، رعنا، لبنیٰ اور ممتاز کے،

کتھا کے روندر، سریش اور پونم کے،

آپ سب کے لیے نہایت پرتپاک شکریہ! یہ کتاب آپ سبھوں کی ہے۔

گیتا دھرماراجن

فروری، ۱۹۹۸ء

فہرست

○●○

اس مجموعے کے بارے میں

ڈاکٹر محمد علی صدیقی

کتھا یونیسکو کے اشتراک سے شائع ہونے والے اردو افسانہ کے موجودہ انتخاب کے مدیروں کے پیش نظر یہ امر رہا ہے کہ برِصغیر کے اردو سماج کی زمینی حقیقتوں کا اثبات کئے بغیر ایک افسانہ ہی پر کیا موقوف، ادب اور کلچر کے بھی بنیادی مسائل حیطۂ ادراک میں نہیں آسکتے۔ برصغیر کی آزادی کے پچاس سال کی مناسبت افسانہ نگاری کے میدان میں جس مشترکہ ورثہ کی نشان دہی کرتی ہے وہ ماہرین لسانیات اور عوام پر بخوبی روشن ہے۔

اردو زبان آریائی زبانوں کے لسانی خاندان کی ایک شاخ شورسینی پراکرت سے تعلق رکھتی ہے۔ اردو اور ہندی برج بھاشا کے علاقہ کی پیداوار ہیں۔ اردو کے تشکیلی دور میں سندھ اور جنوب مغربی پنجاب میں وقوع پزیر ہونے والی لسانی اور تہذیبی اشتراک کو بھی یقینی طور پر بہت دخل ہے۔ لیکن اردو فی الاصل کھڑی بولی سے نکلی ہے۔

یوں سمجھئے کہ اس زبان کی جڑیں ایک طرف ۱۲۰۰ء تک کی سندھی، سرائیکی اور پنجابی شاعری میں مل جاتی ہیں اور پھر تیرھویں صدی میں دہلی پر ترک اور پٹھان حکمران خاندانوں کی حکومت کے زمانے میں یہ صوفیوں اور سنتوں کی زبان بن جاتی ہے۔ اردو کا پہلا شعر ۱۲۳۴ء سے ۱۲۳۹ء کے عرصہ میں لکھا گیا ہے۔

من کی نگری کو تب کریں آبادان

ناصرالدین سے جب ملیں موحدین کیادان

ہمیں اس دور میں دکن میں اردو کے کسی شاعر کا علم نہیں ہے۔ امیر خسرو ۱۲۰۸ء میں پیدا ہوئے لیکن ان سے پہلے صوفی بزرگ حضرت فرید گنج شکر کو جو بابا فرید (۱۱۸۶ء تا ۱۲۶۵ء) کے نام سے مشہور ہیں، اردو کے اولین شاعر ہونے کا شرف حاصل ہے۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیے۔

وقتِ سحر وقتِ مناجات ہے — خیزدراں وقت کہ برکات ہے

بادم خود ہمدم وہشیار باش — صحبت اغیار بوری بات ہے

دُھن رے دُھنیئے اپنی دُھن — پرائی دُھنی کا پاپ نہ پن

تیری رُوئی میں چار بنولے — سب سے پہلے ان کو چن

تیرا پیا تو مہاگنی ہے — کرلے تو بھی کوئی گن

جو تو چاہے ہر کو فرید — آنکھ، کان کرلے سن

امیر خسرو (۱۲۰۸ء تا ۱۳۲۵ء) بابا فرید کے بعد ہی شعری اُفق پر نمودار ہوئے۔ وہ اپنے گیتوں، رنگوں، دوہوں، اور پہیلیوں کی وجہ سے ہندو مسلم تہذیب کے درخشاں ستارے ٹھہرتے ہیں۔ بعض محققین انہیں اردو کا پہلا شاعر قرار دیتے ہیں۔ ان کا شعری نمونہ پیش خدمت ہے۔

رنگ:

آج رنگ ہے

اے ماں آج رنگ ہے ری

---

(۱) معزالدین (۲) کیقباد

میرے محبوب کے گھر رنگ ہے ری
اے ماں رنگ ہے
موہے پیر پایو نجام دین اولیا
اے ماں رنگ ہے۔

یا پھر یہ پہیلی:

(آسمان)

ایک تھال موتیوں سے بھرا
سب کے سر پر اوندھا دھرا
چاروں اُور وہ تھال پھرے
موتی اُس سے ایک نہ گرے

اب کبیر داس (۱۳۹۸ء تا ۱۵۱۸ء) کا یہ دوہا پڑھیے:

چلتی چاکی دیکھ کر، دیا کبیرا روئے
دو پاٹن کے بیچ میں ثابت بچا نہ کوئے

گورو نانک (۱۴۶۹ء تا ۱۵۳۸ء) کا مندرجہ ذیل شبد بھی اردو اور پنجابی کے مابین گہرے رشتوں کی عکاسی کرتا ہے اور اردو کے کھڑی بولی کے رنگ سے پہلے کے دور کی نمائندہ مثال ہے:

چوتھی نیت راس من پنجویں صفت ثنائی کرنی کلمہ آکھ کے تا مسلمان سدائی

تلسی داس (۱۴۹۷ء تا ۱۶۲۳ء) مغلیہ دور کے ہندی شاعر ہیں۔ یہ امر باعثِ حیرت ہے کہ تلسی داس کی شاعری کو اردو شعری روایت میں جگہ نہ مل سکی:

ہم چاکر رگھبیر کے پٹو لکھو دربار
تلسی اب کا ہوہنگے نر کے منصب دار

پنڈت چندر بھان برہمن (۱۵۷۵ء تا ۱۶۶۲ء) بھی مغلیہ دور ہی کے شاعر ہیں:

خدا کس شہر اندر ہمن کولائے ڈالا ہے
نہ دلبر ہے نہ ساقی ہے نہ شیشہ ہے نہ پیالا ہے

اس کے بعد محمد افضل میرٹھی، مرزا عبدالقادر، بیدل، شاہ عماد قلندر، میر جعفر زٹلی اور خواجہ مانی کا دور آیا اور ان حضرات کے بعد اردو غزل کے باوا آدم ولی دکنی کا عہد شروع ہو گیا۔ لیکن ان کے باوا آدم ہونے سے اس دعویٰ کا بطلان ممکن نہیں ہوپاتا کہ اردو دکن میں اپنے رواج سے بہت پہلے شمالی ہند کے مسلمانوں اور ہندوؤں کی مشترکہ عوامی زبان کی صورت میں موجود تھی۔

مندرجہ بالا موقف کی حقیقت اردو نثر کے حوالے سے بھی اپنی جگہ درست ہے کہ اردو نثر کا آغاز فورٹ ولیم کالج کے زمانہ سے کچھ قبل ہو گیا۔ اس زمانہ کی بیشتر نثر داستاں گوئی اور مذہبی کتب پر مشتمل ہے۔ داستاں گوئی ہی کی عمل داری فسانۂ آزاد تک باقی رہتی ہے اور اسی رجحان کے خلاف سرسیّد احمد خاں، ڈپٹی نذیر احمد، اور شبلی سامنے آتے ہیں۔ اردو کی رومانی تحریک بالخصوص سجاد حیدر یلدرم کے افسانے بھی سرسیّد اور ان کے رفقاء کی خشک نثر کے خلاف رنگ آمیزی سے عبارت ہیں۔ راشد الخیری کے افسانوں اور ناولوں کو ڈپٹی نذیر احمد کی روایت کی توسیع قرار دیا جاسکتا ہے۔ لیکن یہ اعزاز منشی پریم چند ہی کو حاصل رہے گا کہ انہوں نے سرسیّد کی سلیس اور مقصدی نثر کی تحریک کو آگے بڑھایا۔ ان کے ہم عصروں میں علی عباس حسینی، سدرشن اور اعظم کریوی وغیرہ شامل ہیں۔

برطانوی راج بمبئی، مدراس اور بنگال پریزیڈینسیوں میں، اٹھارویں صدی کے نصف آخر میں اور شمال مغربی ہندوستان میں ۱۸۰۳ء میں ایک حقیقت بن گیا۔ ہم اٹھارویں صدی کے آخری اور انیسویں صدی کے پہلے رُبع میں ہندوستانی درباروں میں انگریز اور یورپی شعراء کو اپنا اردو کلام سناتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ مغربی مبلغ اس عرصہ میں ہندوستان کی بیشتر زبانوں کی صرف و نحو اور لغتوں پر کام کرتے ہوئے ملتے ہیں۔ وہ ایک ہاتھ میں بندوق اور دوسرے میں انجیل تھامے ہوئے تھے۔ اردو افسانہ، قصہ یا داستان کی شکل میں تو پہلے ہی سے

موجود تھا۔ انگریزی تعلیم سے بہرہ ور نسل نے جب افسانہ کے اوّلین نمونے پڑھے تو اسے خیال پیدا ہوا کہ افسانہ تو بہت کام کی چیز ہے۔ بات ہی بات میں انسانی زندگی کا ایک رُخ پیش کر دیا جاتا ہے اور پڑھنے والے کسی کردار یا واقعہ کے بیانیہ سے یوں متاثر ہوتے ہیں جیسے یہ تخلیقی سابقہ محض ان کی زندگی کو متاثر کرنے کے لئے منصۂ شہود پر آیا ہو۔

انیسویں صدی کے نصف آخر میں جب اردو ہندی قضیہ میں جوش نے ہوش کی جگہ لی تو ۸۱-۱۸۸۰ء میں شمالی ہند میں ۸۱ فیصد اردو جرائد اور اخبارات کے مالکان ہندو تھے۔ سوامی دیانند جیسے آریا سماجی بھی ''یجروید'' کا اردو ترجمہ کر رہے تھے۔ آریہ سماجی تحریک اور ان کے مخالفین کے مابین بحث و مباحثہ اردو ہی میں ہو رہا تھا۔ بیسویں صدی کے پہلے عشرہ میں اتر پردیش کے ایک دیہی اسکول کا استاد پریم چند کے قلمی نام سے اردو فکشن کے ایک بنیاد گذار کی صورت اختیار کر چکا تھا۔ پنجاب میں سدرشن اپنے علاقہ کی دیہی اور شہری زندگی کی افسانوی پیش کش میں جٹے تھے اور بنگال اسکول آف لٹریچر اور اس سے مستزاد موسیقی، مصوری، غرض یہ کہ ہمہ فنون ہندوستان اور مغرب کے امتزاج کی کیفیت سے گذر رہے تھے، یہاں تک کہ برہمو سماج کے حامی ہندو مت اور عیسائیت میں بعینہٖ مشابہتیں تلاش کرنے لگے، جس طرح سرسیّد احمد خاں، اسلام اور عیسائیت میں۔ یہ وہ فضا تھی جس میں اردو افسانہ کا ارتقاء ہوا۔ بیسویں صدی کے پہلے دو عشرے انیسویں صدی کے نصف آخر میں قحط اور وبا کی نتیجہ کے طور پر دیہی آبادی کی شہروں کی طرف مراجعت اور چھوٹی موٹی ہندوستانی صنعتوں کے قیام کا اوّلین دور ہے۔ ان دو عشروں میں دیہاتیوں نے شہری زندگی اور شہریوں نے دیہاتیوں کو ذرا زیادہ قریب سے اور بسا اوقات، تجرباتی طور پر دیکھا۔ اردو افسانہ بیسویں صدی کے ان پہلے دو عشروں میں ہونے والی سماجی اُتھل پتھل کا منطقی نتیجہ تھا۔ اس دور میں ہندوستانی معیشت اور سماج ہر دو میں واضح تبدیلیاں نظر آنے لگی تھیں اور اب وہ نسل پیدا ہو چکی تھی جو غیر متناسب طول طویل داستانوں کے بجائے افسانہ کے اختصار اور تناسب کی طرف راغب ہو۔

اس صدی کی دوسری دہائی میں برطانیہ ذمہ دارانہ خود حکومتی کے مطالبہ پر اس حد تک

ضرور آگے آیا کہ جنگ عظیم دوئم کے بعد مانٹیگو چیمسفورڈ اصلاحات ۱۹۱۹ء ایکٹ کی شکل میں نافذ ہوگئیں جس کے نتیجہ میں ہندوستان میں دوہری حکومت کا اصول نافذ ہوگیا یعنی صوبائی حکومتوں کے بعض معاملات میں تاج برطانیہ کی مکمل عمل داری اور بعض میں منتخب نمائندوں کی۔

۱۹۱۹ء ہی میں جلیانوالا باغ امرتسر کا سانحہ پیش آیا۔ ۱۹۲۰ء میں کانگریس کے پلیٹ فارم پر مہاتما گاندھی کی آمد اور اس کے بعد اس وقت کے قوم پرست رہنما محمد علی جناح کی کانگریس سے علیٰحدگی برصغیر کی تاریخ کے اہم واقعات ہیں۔ اس کے بعد ہم سائمن کمیشن (۱۹۲۷ء)، راؤنڈ ٹیبل کانفرنس (۱۹۳۰ء تا ۱۹۳۲ء)، کمیونل ایوارڈ (۱۹۳۲ء) اور گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ (۱۹۳۵ء) کی طرف بڑھتے ہیں۔ ایک طرف ہمارے برصغیر کے دو بڑے ثقافتی گروپ ایک دوسرے پر عدم اعتماد کی فضا کے شکار ہوگئے اور دوسری طرف دنیا بھر کے محنت کش اور دانشور نازی ازم اور فاشزم کے خلاف ایک دوسرے کے قریب آتے ہوئے نظر آنے لگے۔ اس سیاسی اور سماجی تناظر میں اب ادبی صورت حال کا مطالعہ کیجئے۔

پیرس کی بین الاقوامی ترقی پسند کانفرنس کے بعد ۱۹۳۶ء میں لکھنؤ میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی بنیاد رکھی گئی۔ اس طرح درونِ خانہ فرقہ وارانہ مسئلہ سے دوچار برصغیر کے دانشوروں کو بین الاقوامیت پر اصرار کرنے کا ایک اعلیٰ نصب العین حاصل ہوگیا۔ منشی پریم چند کے پہلے افسانہ سے انجمن ترقی پسند مصنفین کی تاسیس کے بعد منشی پریم چند کے سال انتقال (۱۹۳۶ء) کے درمیان جتنے افسانہ نگار آئے، سلطان حیدر جوش، نیاز فتح پوری، مجنوں گورکھ پوری، اختر حسین رائے پوری، احمد علی، رشید جہاں، علی عباس حسینی، عصمت چغتائی اور اعظم کریوی وغیرہ وغیرہ، ان سب میں قدرِ مشترک یہ ہے کہ پیچیدہ سے پیچیدہ سماجی، فرقہ وارانہ معاشی صورتِ حال کے باوجود قلم کار کسی نہ کسی طرح ہندوستانی حقیقتوں کے ترجمان نظر آتے ہیں۔ افسانہ ویسے بھی زندگی کی ایک قاش ہوتا ہے۔ ہندوستانی افسانہ کی قاشوں کی یکجائی سے ہندوستانی زندگی کے بہت سے نئے رُخ سامنے آگئے۔

ترقی پسند مصنفین کے قیام کے بعد ۱۹۳۸ء میں لاہور میں حلقۂ ارباب ذوق وجود میں

آیا جس نے شروع شروع میں صرف شاعری سے علاقہ رکھا۔ بعد میں افسانہ اور افسانہ نگاروں کے بارے میں مولانا صلاح الدین کی تحریروں سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مولانا کرداروں کی ظاہری زندگی کی ترجمانی سے زیادہ کرداروں کے ذہنوں کا مطالعہ بھی ضروری سمجھتے تھے۔ وہ ادب اور پروپیگنڈہ کے مابین فرق قائم کرنے پر زور دیتے تھے۔ دہلی، لکھنؤ، عظیم آباد اور حیدر آباد کے روایتی مراکز کے مقابلہ میں لاہور، آزادروی کا زیادہ قائل ہوتا آیا ہے اور ہوتا رہے گا۔ منٹو ایک زمانہ میں ترقی پسند کیمپ سے ذہنی مناسبت رکھنے کے باوجود جہاں ضروری سمجھتا تھا وہاں خود کو ہر نوع کی پابندیوں سے آزاد بھی گردانتا تھا۔ غلام عباس، محمد حسن عسکری، ممتاز شیریں اور قرۃ العین حیدر نے جلی یا خفی اقدار میں اپنے کاندھوں پر ترقی پسندانہ نقطۂ نظر کا حقیقی یا مفروضہ بوجھ قبول نہ کیا لیکن یہ سب قلم کار جدید حسیت کے ترجمان ہیں۔

بہر حال تقسیم برصغیر تک افسانہ کے بعض واضح رویے سامنے آئے ہیں۔ ادب کے ذریعہ انسانی زندگی پر اثر انداز ہونے کا رویہ، جو ترقی پسندوں میں بطور خاص مقبول تھا۔ ادب کی خود مختاری پر اصرار کرنے والا رویہ، جس نے ہر قسم کے ادب کو ادیب کی خود مختاری کے نام پر قبول کیا، اور وہ روایتی مکتب فکر، جس نے ادب کے ذریعہ مذہب کی خدمت کا بیڑا اٹھا رکھا تھا، ایک رویہ یہ بھی تھا کہ ادب کے ذریعہ جنسی غدودوں کو متحرک کر دیا جائے۔ آخر الذکر دونوں صورتیں لٹریچر کی بحث میں سنجیدہ مکتب فکر تسلیم نہ کی جا سکیں۔

تقسیم کے بعد ادھر بیان کردہ صورت حال کی عمل داری جاری ہے لیکن تقسیم برصغیر (۱۹۴۷ء) کے نتیجہ میں ہونے والے فسادات نے اردو افسانہ کو اس بری طرح جھنجھوڑا کہ اس دور میں شاید ہی کوئی ایسا افسانہ نگار ہو جس نے فسادات کی جنونی صورت حال پر نہ لکھا ہو۔ میرا خیال ہے کہ برصغیر کی سیاست میں ۱۹۱۶ء سے ۱۹۲۰ء تک جس فرقہ وارانہ ہم آہنگی کا مظاہرہ دیکھنے کو ملتا ہے اسی نوع کا مظاہرہ ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۱ء تک افسانہ نگاری میں جاری و ساری نظر آتا ہے۔ ان فسادات کے نتیجہ میں برصغیری معاشرہ میں بہت بنیادی تبدیلیاں پیدا ہوئیں۔ فسادات کے بعد قائم ہونے والے معاشروں میں جاری تنگ و تاز جدید حسیت

کے فروغ کا بہت بڑا سبب بن گئی۔ اردو افسانوں کا زیرِنظر انتخاب اس لحاظ سے منفرد ہے کہ یہ ایسے افسانوں پر مشتمل ہے جس میں برصغیری اردو سماج کا دردِ مشترک دیکھا اور محسوس کیا جا سکتا ہے۔ زندگی کے التباس کو اس کے حقائق سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ وہ پنڈولم ہی کیا جس کا آہنگ زندگی کی ترغیبوں اور تقاضوں پر قائم نہ ہو۔ جب تک ہمارے چھوٹے چھوٹے ملال، چھوٹی چھوٹی خوشیاں اور چھوٹے چھوٹے غم بیک وقت سلامت ہیں اور ان کے اظہار کی زبان موجود ہے، ہم تخلیقی اظہار کے تضادات میں بھی کوئی نہ کوئی ارتکاز دیکھتے رہیں گے، چاہے نت نئی صورتِ حال میں اس ارتکاز کی نوعیت میں بھی تغیر رونما ہوتا رہے۔ ہمیں یہ حقیقت فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ اردو ادب کے مراکز میں نہ صرف ہندوستان بلکہ پاکستان میں بھی نئے نئے نام سامنے آ رہے ہیں۔ کبھی ساحلِ کوکن اور کبھی ساحلِ مکران سے ایک ایسی سیپی مل جاتی ہے جس کا ''صدف'' ہماری پسند و ناپسند کی متحجر تعریفوں کو پگھلا دیتا ہے۔ زندہ زبان کی پہچان یہ ہے کہ وہ تند خو دریا کی طرح اپنا راستہ بدلتی رہتی ہے۔ دریا کا مخرج ایک، بہاؤ کے لئے درکار میدان ایک، ڈیلٹا ایک، اسے ضم کرنے والا ساگر ایک، لیکن تفصیلات بدلتی رہتی ہیں۔ کل جہاں آبادی تھی اب وہاں دریا کا پاٹ ہے اور کل جہاں دریا کا پاٹ تھا وہاں آبادی ہے۔ دریا کو وقت سے تشبیہ دی گئی ہے اور انسانی تخلیق کا دریا اپنے بہاؤ کا نقطہ زمین کے طول البلد اور عرض البلد کے محض جغرافیائی انضباط سے قطع نظر انسانی تخیل کی موج یا اڑان پر رکھتا ہے۔ اس مجموعے میں شامل تمام افسانوں میں ہمیں ایک مختلف النوع حسیت کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ یہ حسیت نئی زندگی کے تقاضوں سے آنکھیں ملاتی ہے۔ اس انتخاب کی تحریریں اپنے لکھنے والوں کی زندگی پر اثرانداز ہونے والے کسی ایسے رُخ کو پیش کرتی ہیں جو ان کا ذہنی تموج قاری کے دل و دماغ میں بھی ویسے ہی پیدا کر سکے۔ تخلیقی فنکار کی سب سے بڑی خواہش یوں ہی پوری ہوتی ہے کہ وہ اپنی تخلیق کا ایک اور خالق پا لے جو اس کی تحریر کو اپنے تلازموں سے جوڑ کر حد درجہ مشترک اور حد درجہ مختلف معنی دے سکے۔ زندگی جو بھی گذارے، اس کی چابک دست عکاسی لوگوں میں اپنائیت اور اس زندگی سے ہم رشتہ ہونے کی خواہش بیدار

کر سکتی ہے۔ یہی وہ قدرت ہے جو قارئین کے یہاں نارسائی کا ملال دور کرتی ہے۔

سب سے پہلے ان افسانوں کے عاد اعظم مشترک کی بابت بات کی جائے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ ان افسانوں کے بارے میں ہمارا یہ دعویٰ نہیں ہے کہ صرف یہی اور یہی وہ افسانے ہیں جن کے خالقوں میں وہ عاد اعظم مشترکہ موجود ہے جس کے ہم متلاشی ہیں۔ ہمارے خیال میں ایسے متعدد نام کلبلا رہے ہیں جو اس مجموعہ کی محدود ضخامت کی وجہ سے اس مجموعہ میں شامل نہ ہو پائے۔ ہم ایک اور مشکل سے بھی دوچار ہوئے۔ ہم نے مکاتبِ فکر اور ادبی مراکز کی قیود سے بالاتر ہونے کی کوشش کی تاکہ ہمارا انتخاب زیادہ نمائندہ ہونے کی شرط پوری کر سکے اور روایتی ادبی ڈھرے سے مختلف قرار پائے۔ اس طرح ہم اس مجموعہ میں بعض پرانے ادیبوں کی عدم شمولیت اور بعض نسبتاً نئے ادیبوں کی شمولیت کے بارے میں صرف اس قدر کہہ سکتے ہیں کہ اس انتخاب میں ایک اور لحاظ بھی پیش نظر ہے، وہ یہ ہے کہ ہمارا انتخاب کلیتاً ہمارے پرانے لکھنے والوں کی تخلیقات پر ہی مشتمل نہ ہو بلکہ اس انتخاب میں تازہ دم نفوس بھی شامل ہو سکیں۔ متعدد قارئین کو مدیران کے انتخاب سے کلی اتفاقِ رائے نہ ہو سکے گا اور ہر قاری کے ذہن میں ایک ترمیم شدہ فہرست ہو گی۔ ہم آپ کی خدمت میں صرف اپنی فہرست پیش کر رہے ہیں۔ ان منتخب افسانوں میں اردو سماج کی زندگی کے بعض ایسے رخ سامنے آ گئے ہیں جن کی عکاسی کرتے ہوئے تخلیق کار بڑی اذیت سے گزرے ہوں گے۔ تخلیقی اذیت اور جمالیاتی مسرت کے مابین قریبی تعلق ہوتا ہے۔ سو وہ ان افسانوں میں بھی موجود ہے۔ ہماری زندگی حزن و ملال کا ایک مرکب ہے، جسے صرف اسی وقت سکون میسر آ سکتا ہے جب اس حزن و ملال کے بین السطوری اشاروں کے ساتھ احساس رفاقت یا احساسِ شرکت جاگ سکے۔

برصغیر کی آزادی کی پچاس سالہ زندگی میں ایک طرف دونوں معاشروں کے رہنماؤں کی جانب سے آدرشوں کی بے معنی لن ترانی پر زور ہے۔ اس لن ترانی میں شور ہے۔ زندگی کی موسیقی نہیں ہے۔ دوسری طرف انسانی زندگی کی وہ ساعتیں اور وہ منزلیں ہیں جن کی موجودگی کا احساس ہی ہمیں انسانی زندگی کی رفعتوں سے روشناس کر دیتا ہے۔ ہمیں کسی اجنبی کی

آنکھوں میں اپنی تمثال دیکھنے کا خوف نہیں ہے۔ بلکہ اجنبی کی آنکھوں میں اپنی صورت دیکھنے کی واردات ہماری بے پایاں مسرت سے عبارت ہے۔ ایسا ہو پانے کے بعد زندگی زیادہ با معنی ہو جاتی ہے۔ اس تعلق سے موجودہ اردو افسانہ کی وسیع تر موضوعی اور فنی جہات ہمارے قارئین کی خصوصی توجہ کی متقاضی ہیں۔ یہ افسانے گذشتہ پچاس سال کے دوران لکھے گئے افسانوں کا توضیحی انتخاب نہیں ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو پھر ہم عصمت چغتائی، منٹو، قاسمی، غلام عباس، ہاجرہ مسرور، خدیجہ مستور، اشفاق احمد، کرشن چندر، بیدی، رام لعل، قاضی عبدالستار اور کئی دوسروں کو کس طرح فراموش کر سکتے تھے۔ یہ انتخاب عصری مناظر میں گذشتہ کل کا وہ سایہ ہے جس سے مستقبل عبارت ہے۔ مزید برآں یہ جدید حسیت کے بعض ایسے پہلوؤں کی عکاسی کرتا ہے، جس سے برصغیر کے اردو افسانہ میں مقامی اسباب کی بنا پر سماجی تبدیلیوں میں بہت وقیع رویے سامنے آتے ہیں۔ اس انتخاب میں ۱۹۶۰ء کے بعد کے تحریر کردہ افسانوں کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔ ان افسانوں میں بحرانوں کے ہنگام اور تخلیقی کاوشوں کے ایسے نمونے پیش کئے گئے ہیں جن میں نئی زندگی کا ایک قابل قدر تموج ملتا ہے۔

ہندوستانی اور پاکستانی افسانوں کے اس انتخاب کی ذمہ داری ڈاکٹر سکریتا پال کمار اور میرے سر ہے اور ہم دونوں کے پیش نظر جو کلیہ رہا ہے وہ بہت سادہ ہے: تخلیقی ساعتوں کے ان لمحات کی پیش کش، جن میں سماجی تبدیلیوں کے مرقع نگاری کے لئے بالعموم ایک جیسے رویوں کی کار فرمائی نظر آتی ہے۔ ایک جیسے رویے مشترکہ رویے نہ ہوتے ہوئے بھی قابلِ غور ضرور ہوتے ہیں۔ ہمارا زاویہ نظر بھی سماجی سائنسدانوں کے لئے متعدد زاویہ ہائے نظر کے ہجوم میں ایک اور زاویہ ہوگا۔ بس جس طرح تخلیق کے ہزار شیوے ہوتے ہیں اسی طرح تخلیقات کے اندر جاری و ساری دنیاؤں کے دریچوں سے ہزاروں مناظر دعوتِ نظارہ دیتے رہتے ہیں۔

اس امید کے ساتھ اپنے قارئین سے رخصت چاہتے ہیں کہ ہمارا زاویہ نظر بھی لائق توجہ ٹھہرے گا۔□□

امراؤ طارق

امراؤطارق قلمی نام۔اصلی نام سید امراؤ علی ہے۔ انہوں نے ایم۔اے اور ایل ایل۔ بی کی ڈگریاں حاصل کیں۔ بلدیہ پولیس ٹریننگ کے وائس پرنسپل ہیں۔ "نگار پاکستان" کے مدیر معاون کی ذمہ داری قبول کررکھی ہے۔ان کے افسانوی مجموعے "بدن کا طواف" پر انہیں "آدم جی لٹریری ایوارڈ" ملا تھا۔ان کی ایک مشہور کتاب "دھنک کے باقی ماندہ رنگ" دس نامور اور نمائندہ شخصیتوں کے قلمی خاکوں پر مشتمل ہے۔ حال ہی میں ان کا ایک نیا ناول "معتوب" شائع ہوا ہے۔ آج کل انجمن ترقی اردو پاکستان کے نہایت سرگرم جوائنٹ سیکریٹری ہیں اور انجمن کے بک پبلیکیشن ڈویژن کی نگرانی اور انتظامیہ کی ذمہ داری نبھارہے ہیں۔ "آخری اسٹیشن" پہلی بار ماہنامہ "صریر" کے سالنامہ (۱۹۹۶ء) میں شائع ہوا تھا۔

آخری اسٹیشن

امراؤ طارق

کسی کو معلوم نہ تھا کہ یہ کون سا اسٹیشن ہے۔ اس اسٹیشن کا نام کیا ہے۔ اسٹیشن ماسٹر کا کمرہ مقفل تھا۔ ٹکٹ گھر کی کھڑکی کا پٹ گرا ہوا تھا اور اندھی آنکھ کی طرح بے نور تھا۔ بے چھت پلیٹ فارم ویران پڑا ہوا تھا۔ پلیٹ فارم کے دونوں سروں پر اسٹیشن کے نام کے سائن بورڈ کالک سے اس طرح پتے ہوئے تھے کہ اُن پر لکھے ہوئے حروف کا کوئی نشان باقی نہ رہ گیا تھا۔ ریلوے کے عملے کا کوئی آدمی دُور دُور نظر نہ آتا تھا۔ اسٹیشن کے باہر بنا ہوا سگنل کیبن ویران تھا۔ لائن بدلنے والے کانٹے کے دستے بندوقوں کی طرح آسمان کی طرف تنے ہوئے تھے۔ آدمی کوئی نہ

تھا۔ تیسرے درجے کا تین طرف سے کھلا ہوا ویٹنگ روم ویران پڑا ہوا تھا۔ کوئی کتا، کوئی جانور اور کوئی رینگتا ہوا کیڑا تک نظر نہ آتا تھا۔ اسٹیشن سے باہر سڑک ویران تھی۔ سڑک پر ان گھڑ روڑے بھاری رولر کے نیچے کوٹے جانے کے انتظار میں بکھرے پڑے کچے تک پھیل گئے تھے۔ سڑک کے اس پار ریلوے کے عملے کے سرکاری مکان خالی پڑے تھے۔ دروازوں پر قفل پڑے ہوئے تھے۔ بعض مکانوں کے دروازوں پر ٹاٹ کے پھٹے پردے ہوا سے اس طرح ہل رہے تھے کہ ان کے مقفل دروازوں کے کالے پیلے تالے صاف نظر آجاتے تھے۔ درختوں پر کوئی پرندہ نہ تھا۔ فضا میں کوئی ابابیل نہ تھی۔

ٹرین میں بیٹھے مسافر جیسے سکتے میں ہوں۔

سورج غروب ہونے میں اب تھوڑی دیر رہ گئی تھی۔

ٹرین اب تک شمال کی طرف چلتی رہی تھی اور شمال کی طرف سطح سمندر سے ایسی بلند تھی کہ جب ٹرین روانہ ہوئی تھی اس وقت آگے لگے ہوئے دو انجن اسے چلا رہے تھے۔ جنوب سے شمال کی چڑھائی چڑھتے ہوئے ٹرین پہلے آوٹر سگنل سے گزری پھر جنوبی کیبن سے اور پھر پلیٹ فارم سے الگ آوٹر لائن پر رُک گئی تھی۔ یوں جیسے پلیٹ فارم والی لائن پر شمال کی جانب سے کوئی اور ٹرین آنے والی ہو۔

جب ٹرین اپنی منزل کی سمت روانہ ہوئی تھی اس وقت یہ مکمل ٹرین تھی۔ اس میں چار بوگیاں پھر کچھ گیروے رنگ کی مال گاڑی کے کھلے کئی ڈبے اور پھر آخر میں مسافروں کے لیے ایک اور بوگی لگائی گئی تھی اور ٹرین کے آگے پیچھے دونوں طرف انجن لگے ہوئے تھے۔ گاڑی پتھر کے کوئلوں کے انجن سے چلائی گئی تھی۔

ٹرین ایک اسٹیشن پر رُکی جس کے آس پاس کے تمام گاؤں اور شہروں میں بیماری پھیلی ہوئی تھی اور لوگ دھڑا دھڑ مر رہے تھے اور میونسپلٹی والے جس گھر میں موت ہو جاتی اُس کے دروازے کے پاس دیوار پر ایک چھوٹی آڑی لکیر سے دوسری چھوٹی آڑی لکیروں کو کاٹ

کر گھر میں بیماری گھس بیٹھنے کا نشان لگا دیتے۔ گاؤں کے آدھے سے زیادہ مکانوں کے دروازوں کے قریب دیواروں پر یہ نشان لگا ہوا تھا جب ٹرین پہنچی۔

پہلے تو سب یہی کہتے رہے کہ حالات پر قابو پالیں گے۔ گاؤں، گھر چھوڑنے کی کوئی ضرورت پیش نہ آئے گی نقل مکانی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن جب آس پاس تک یہ بیماری پھیل گئی اور لاشوں پر لاشے اُٹھنے لگے تو لوگ بھاگنے لگے۔

شبراتی جولاہا، رمضانی تخلہ، حافظ آتشباز اور مولانا سدن تو عصر کی نماز کے بعد بڑی مسجد کی فصیل پر سر جوڑ کر بیٹھ جاتے اور خوف اُن کے چہروں پر نیم کے سائے کی طرح ڈولنے لگتا اور یہ آپس میں ایک دوسرے کو ڈھارس دیتے مگر اندر ہی اندر اور زیادہ خوفزدہ ہو جاتے۔

ضلع کمشنر گاؤں والوں کو اطمینان دلانے آیا تو گاؤں میں بازار کا دن تھا۔ اِکا دُکا دکانیں دوسرے گاؤں سے بھی آگئی تھیں۔ سب گاؤں کے بازار میں جمع ہو کر کمشنر کو اس طرح دیکھ رہے تھے جیسے نجات دہندہ آگیا ہو۔ اُس کے ساتھ تھانیدار، پولیس پلٹن اور لاؤلشکر سب ہی کچھ تھا۔

بڑی احتیاط سے مختصر تقریر کی اور یقین دلایا کہ حالات قابو میں رہیں گے۔ بھاگنے کی ضرورت نہیں ہے۔ تھانیدار بھی کمشنر کی ہاں میں ہاں ملاتا رہا اور سہما سہما چاروں طرف اس طرح دیکھتا رہا جیسے کسی گلی سے ابھی کوئی نکلے گا اور اُس کے پیٹ میں خنجر گھونپ دے گا۔

کمشنر تقریر کر کے گیا تو اُسی رات کئی آدمی مر گئے۔

تیلی چھوٹی مسجد کے سامنے کی کچی دیوار پر چڑھ کر چلایا۔

"شبراتی رے شبراتی۔"

"اُوے ملا آتش باج۔"

"رمجانی تخلے۔"

"حاجج جی۔"

"وِشواش گھات ہوئی گوا۔"

ٹرین آکر رُکی تو شبراتی، رمضانی، حافظ آتشباز مولانا سدن گاؤں والوں کے ساتھ پلیٹ فارم پر موجود تھے۔

گاؤں والے اپنے سامنے آجانے والے ڈبے میں سوار ہونے لگے اُس پوری بوگی میں تھوڑے سے خستہ حال مسافر پہلے سے بیٹھے تھے۔ جب یہ بوگی بھرنے لگی تو بعض مُسافر اگلے انجن کے ساتھ جُڑے ڈبے میں گھسنے لگے۔

''پیچھے جاؤ۔اس بوگی میں جگہ نہیں ہے۔پانی بھی نہیں ہے۔''

پریشان حال مسافر اس بوگی سے جُڑی دوسری بوگی میں چڑھنے لگے۔

''پیچھے جاؤ۔اس بوگی میں مت گھسو۔یہاں پانی نہیں ہے۔''

مجبوراً مسافر تیسری بوگی کی طرف لپکے۔

''پیچھے جاؤ۔دونوں بوگیاں خالی ہیں اور مال گاڑی کے ڈبے لگے ہیں اُن پر سوار ہو جاؤ۔''

''مال گاڑی پر سوار ہونا جرم ہے، ناجائز ہے۔''

''اب کچھ ناجائز نہیں ہے۔یہ دیکھو گے تو گاڑی چھوٹ جائے گی۔''

گاؤں چھوڑ کر آنے والے مسافر زیادہ تر چوتھی اور سب سے آخری بوگی میں سوار ہو گئے اور جو بچ رہے وہ مال گاڑی کے ڈبوں میں، جن پر چھت نہ تھی، سوار ہو گئے۔

گاڑی کو دونوں انجن منزل کی طرف لے چلے۔ چڑھائی سخت، رفتار سست تھی لیکن مُسافر پُرعزم، مطمئن اور خوش تھے۔ پانچوں بوگیاں اور مال گاڑی کے ڈبے انسانوں سے کیا لب بھر چکے تھے۔

جب کئی راتیں مسافروں کو جاگتے گذر گئیں تو وہ دوسروں کی تکلیف کا خیال کیے بغیر پاؤں پسارنے لگے اور یہ احساس جاتا رہا کہ نیند میں پاؤں دوسرے مسافر کے منہ کو لگ رہا ہے۔ رفتہ رفتہ جن میں طاقت تھی وہ اپنوں کے سونے کی جگہ بنانے میں کامیاب ہو گئے اور اپنے برتنوں میں بوگی کا سارا پانی ذخیرہ کرنے لگے۔

سب سے پچھلے ڈبے میں تنازعہ بڑھ گیا۔ اگلے ڈبے اور بوگیوں میں جگہ اور پانی کی کمی

کے باعث اُن بوگیوں میں سے چھوٹے بڑے اسٹیشنوں پر لوگ اُتر اُتر کر چوتھی اور پانچویں بوگی میں کھلے دروازوں سے آنے کے بجائے کھڑکیوں سے کود کود کر بیٹھے ہوئے مسافروں کے اوپر پاؤں رکھ کر آنے لگے۔ ڈبے کے اندر جوں جوں جگہ تنگ ہونے لگی تنازعہ بڑھتا گیا۔

پانچویں بوگی کے مسافروں نے اندر سے سارے دروازے اور کھڑکیاں مضبوطی سے بند کرلیں اور دروازوں سے سامان لگا کر اس پر چڑھ کر بیٹھ گئے۔ ہراسٹیشن پر اگلی بوگیوں سے مسافر اُتر کر پانچویں بوگی میں داخل ہونے کی کوشش کرتے رہے۔ دروازہ پیٹتے، کھڑکیاں کھولنے کی کوشش کرتے اور اس پر چھوٹے بڑے جھگڑے ہوتے مگر ٹرین چلتی رہی۔

ایک صبح جب اُجالا پھیلا تو پانچویں بوگی اور پچھلا انجن ٹرین میں لگے ہوئے نہ تھے اور ٹرین صرف چار بوگیوں اور مال گاڑی کے ڈبوں تک باقی رہ گئی تھی۔ پانچویں بوگی اور پچھلے انجن کا کہیں دُور دُور تک پتہ نہ تھا۔

ساری ٹرین میں چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں۔

''وہ لوگ خود اپنی بوگی اور انجن لے کر چپکے سے بھاگ گئے۔''

''شاید اس بوگی اور انجن پر ڈاکوؤں کا حملہ ہو گیا ہو اور بوگی اور انجن ڈاکوؤں نے اپنے قبضے میں کر لیے ہوں۔''

''شاید اگلے انجن کا ڈرائیور رات کو کسی وقت اُن کی بوگی کاٹ کر باقی ٹرین لے آیا ہو۔''

''ایسا نہیں ہو سکتا۔''

''ہو کیوں نہیں سکتا۔''

''کیسے ہو سکتا ہے۔''

''ارے تم کو کیا پتہ اگلی بوگیوں والے اگلے انجن ڈرائیور سے ملے ہوئے ہوں گے۔''

''ہم کو بتائے بغیر ایسی سازش کیوں کر ممکن ہے۔''

''سب کچھ ممکن ہے۔''

مال گاڑی کے ڈبے سے جس کی چھت کھلی ہوئی تھی ایک آدمی چلایا۔
"وشواس گھات ہوا ہے۔"
سب کو بسنتا تیلی یاد آ گیا جس نے چھوٹی مسجد کے سامنے کی دیوار پر چڑھ کر سندیس دیا تھا۔
اس ویران بے آب و گیاہ اسٹیشن پر بے بسی کی رات دبے پاؤں آ ہی گئی۔ ڈبے مردوں، عورتوں اور بچوں سے لبالب بھرے ہوئے تھے۔ جو شیر خوار تھے وہ ماؤں کے سینوں کو جونک کی طرح چمٹے چوس رہے تھے۔ خوف سے ماؤں کے سینوں میں دودھ خشک ہو گیا تھا۔ بچے سہم کر اوندھے منہ ڈبوں کے فرش پر گر گئے تھے۔ مرد گھوڑوں کی طرح کنوتیاں تانے خطرے کی آواز سننے کی کوشش کر رہے تھے۔ اور ذرا ذرا سی آہٹ پر خرگوش کی طرح اُچھل پڑتے تھے۔ ان کے پاس ان کی اور ان کے بچوں کی حفاظت کے لیے نہ ہتھیار تھے نہ تدبیر تھی اور نہ تدبر تھا۔
مال گاڑی کے ڈبوں میں بھرے لوگ سورج غروب ہوتے ہی چلنے والی ٹھنڈی ہوا سے سردی محسوس کرنے لگے تھے۔ بچوں کی حالت بگڑنے لگی تھی۔ وہ ماؤں کے دوپٹے اوڑھے انگریزی ہند سے دو کی طرح سمٹے جا رہے تھے۔ کانپ رہے تھے۔ مچھروں کی یلغار تھے اور ان کا وقت بے سرحدوں پر بہنے والا خون مچھر پی رہے تھے اور ان کے ایک طرف حدِ نظر تک پھیلے ریگستان کی ریت تھی جو اُڑ اُڑ کر ان کے منہ اور آنکھوں میں لبالب بھر گئی اور دوسری طرف گھنا جنگل تھا جس میں سے کوئی درندہ نکل کر ان سب کو اپنا نوالہ بنا سکتا تھا۔ انہیں اپنا چھوڑا ہوا گاؤں، اس کا تحفظ، اس کے کنوؤں کا میٹھا پانی اور ٹھنڈا پانی یاد آ رہا تھا۔ وہ رو رہے تھے اور پچھتاوے ان کے سامنے کھڑے تھے۔

رات بھر خوف، بھوک، پیاس اور بے چینی سے جاگتے رہنے کے باوجود رات کے پچھلے پہر مال گاڑی کے ڈبوں میں بھرے مسافروں کی آنکھ لگ گئی اور جب صبح سویرے ان سب کی آنکھ کھلی تو مسافروں سے بھری چاروں بند دروازوں اور بند کھڑکیوں والی بوگیاں اور انجن ان کے بے چھت مال گاڑی کے ڈبوں کو مسافروں سمیت بے یار و مددگار چھوڑ کر جا چکے

تھے اور اب اس بے آب و گیاہ ویران اسٹیشن پر پلیٹ فارم کے دوسری جانب پٹری پر ان بے چھت مال گاڑی کے ڈبوں کے سوا کوئی بوگی، کوئی انجن اور کوئی ڈبہ نہ رہ گیا تھا۔ جانے رات کے اندھیرے میں کب آگے لگا ہوا انجن کھڑکیوں، دروازوں، چھتوں اور پانی والی بوگیوں کو ان میں بھرے مسافروں سمیت لے کر چلا گیا تھا۔ ان بے چھت مال گاڑی کے ڈبوں میں بھرے مرد، عورتیں، بوڑھے اور بچے حیرت سے ایک دوسرے کا منہ تک رہے تھے اور چاروں طرف دُور دُور تک کوئی چوپایہ حتیٰ کہ کوئی پرندہ نظر نہ آتا تھا۔

فضا میں کوئی ابابیل بھی نہ تھی۔ ☐☐

انتظار حسین

انتظار حسین ۲۱ر دسمبر ۱۹۲۵ء کو ڈبائی ضلع بلند شہر (ہندوستان) میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۴۶ء میں میرٹھ سے ایم۔اے اردو کیا اور ۱۹۴۷ء میں پاکستان منتقل ہو کر لاہور میں مستقل رہائش اختیار کر لی۔ اردو روزنامہ ''مشرق'' میں کالم نگاری کرتے رہے۔ آج کل انگریزی روزنامہ ''ڈان'' کراچی کے لیے ادبی کالم لکھ رہے ہیں۔ ۱۹۴۸ء میں افسانہ نگاری شروع کی۔ ''گلی کوچے''، ''کنکری''، ''آخری آدمی''، ''شہر افسوس'' اور ''خالی پنجرہ'' ان کے چند افسانوی مجموعے ہیں۔ ''چاند گہن''، ''بستی'' ان کے ناولوں میں شامل ہیں۔ تنقیدی مضامین بھی لکھتے ہیں۔ افسانوں اور ناولوں کا کئی ملکی اور غیر ملکی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ افسانوی مجموعہ ''خالی پنجرہ'' ہندی میں بھی شائع ہو کر مقبول ہوا۔ ''زرد کتا'' پہلی بار ۱۹۶۲ء میں ''سویرا'' میں چھپا۔ موضوع اور لہجہ ہر دو اعتبار سے اُن کی مستند داستانی ترجیحوں نے اردو میں ماضی کی بازیافت کی تخلیقی جہد کو رواج دیا ہے۔

زرد کُتّا

انتظار حسین

ایک چیز لومڑی کا بچہ ایسی اس کے منہ سے نکل پڑی۔ اس نے اسے دیکھا اور پاؤں کے نیچے ڈال کر روندنے لگا، مگر وہ جتنا روندتا تھا اتنا وہ بچہ بڑا ہوتا جاتا تھا۔

جب آپ یہ واقعہ بیان فرما چکے تو میں نے سوال کیا: یا شیخ لومڑی کے بچہ کی رمز کیا ہے اور اس کے روندے جانے سے بڑے ہونے میں کیا بھید مخفی ہے؟ تب شیخ عثمان کبوتر نے ارشاد فرمایا کہ لومڑی کا بچہ تیرا نفس امارہ ہے۔ تیرا نفس امارہ جتنا روندا جائے گا موٹا ہوگا۔

میں نے عرض کیا:

یا شیخ اجازت ہے؟

فرمایا: اجازت ملی۔ اور پھر وہ اڑ کر املی کے پیڑ پر

جا بیٹھے۔ میں نے وضو کیا اور قلمدان اور کاغذ لے کر بیٹھا، اے ناظرین! یہ ذکر میں بائیں ہاتھ سے قلمبند کرتا ہوں کہ میرا دایاں ہاتھ دشمن سے مل گیا اور وہ لکھنا چاہا جس سے میں پناہ مانگتا ہوں اور شیخ ہاتھ سے پناہ مانگتے تھے اور اسے کہ آدمی کا رفیق و مددگار ہے، آدمی کا دشمن کہتے تھے۔ میں نے ایک روز یہ بیان سن کر عرض کیا:

یا شیخ تفسیر کی جائے، تب آپ نے شیخ ابو سعید رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ سنایا جو درج ذیل کرتا ہوں:

شیخ ابو سعید رحمۃ اللہ علیہ کے گھر میں تیسرا فاقہ تھا ان کی زوجہ سے ضبط نہ ہو سکا اور انہوں نے شکایت کی۔ تب شیخ ابو سعید باہر نکلے اور سوال کیا۔ سوال پر جو انہوں نے پایا وہ لے کر اٹھے ہی تھے کہ کوتوالی والوں نے انہیں جیب تراشی کے جرم میں گرفتار کر لیا اور سزا کے طور پر ایک ہاتھ قلم کر دیا۔ آپ وہ تراشا ہوا ہاتھ اٹھا کر گھر لے آئے، اسے سامنے رکھ کر رویا کرتے تھے کہ اے ہاتھ تو نے طمع کی اور تو نے سوال کیا، سو تو نے اپنا انجام دیکھا۔

یہ قصہ سن کر میں عرض پرداز ہوا، یا شیخ اجازت ہے؟ اس پر آپ خاموش ہوئے۔ پھر فرمایا:

اے ابو قاسم خضری، لفظ حکم، ہیں اور لکھنا عبادت ہے پس وضو کر کے دوزانو بیٹھ اور جیسا بیتا و یسا رقم کر۔ آپ نے کلام پاک کی یہ آیت تلاوت کی:

پس افسوس ہے ان کے لیے بوجہ اس کے جو انہوں نے اپنے ہاتھوں سے لکھا اور افسوس ہے ان کے لیے بوجہ اس کے جو کچھ وہ اس سے کماتے ہیں۔

اور یہ آیت پڑھ کر آپ ملول ہوئے۔ میں نے سوال کیا۔ یا شیخ یہ آیت آپ نے کیوں پڑھی؟ اور پڑھ کر ملول کس باعث ہوئے؟ اس پر آپ نے آہ سرد بھری اور احمد حجری کا قصہ سنایا جو من و عن نقل کرتا ہوں:

احمد حجری اپنے وقت کے بزرگ شاعر تھے مگر ایک دفعہ ایسا ہوا کہ شہر میں شاعر بہت ہو گئے۔ امتیازِ ناقص و کامل مٹ گیا اور ہر شاعر خاقانی اور انوری بننے لگا۔ قصیدہ لکھنے لگا۔ احمد

حجری نے یہ حال دیکھ شعر گوئی ترک کی اور شراب بیچنی شروع کر دی۔ ایک گدھا خریدا کہ شراب کے گھڑے اس پر لاد کر بازار جاتے تھے اور انہیں فروخت کرتے تھے۔ لوگوں نے بہت انگلیاں اٹھائیں کہ احمد گمراہ ہوا، کلام پاکیزہ سے گزر کر شراب کا سوداگر ہوا۔ انہوں نے لوگوں کے کہنے پر مطلق کان نہ دھرا اور اپنے مشغلہ سے لگے رہے۔ مگر ایک روز ایسا ہوا کہ گدھا ایک موڑ پر آکر اڑ گیا۔ انہوں نے اسے چابک رسید کیا تو اس گدھے نے انہیں مڑ کر دیکھا اور ایک شعر پڑھا، جس میں تجنیس لفظی استعمال ہوئی تھی اور مضمون یہ تھا کہ میں دوراہے پر کھڑا ہوں۔ احمد کہتا ہے چل، احد کہتا ہے مت چل۔ احمد حجری نے یہ سن کر گریبان پھاڑ ڈالا اور آہ کھینچ کر کہا کہ اس زمانے کا برا ہو کہ گدھے کلام کرنے لگے اور احمد حجری کی زبان کو تالا لگ گیا۔ پھر انہوں نے گدھے کو آزاد کر کے شہر کی سمت ہنکا دیا اور خود پہاڑوں میں نکل گئے۔ وہاں عالم دیوانگی میں درختوں کو خطاب کر کے شعر کہتے تھے اور ناخن سے پتھروں پر کندہ کرتے تھے۔

یہ واقعہ سنا کر شیخ خاموش ہو گئے اور دیر تک سر نیوڑھائے بیٹھے رہے۔ پھر میں نے عرض کیا: یا شیخ آیا درخت کلام سماعت کرتے ہیں۔ در آں حالانکہ وہ بے جان ہیں۔ آپ نے سر اٹھا کر مجھے دیکھا، پھر فرمایا: زبان کلام کے بغیر نہیں رہتی۔ کلام سامع کے بغیر نہیں رہتا۔ کلام کا سامع آدمی ہے پر آدمی کی سماعت جاتی رہے تو جو سامعہ سے محروم ہیں انہیں سامعہ مل جاتا ہے کہ کلام سامع کے بغیر نہیں رہتا۔ پھر شیخ نے سید علی الجزائری کا قصہ بیان فرمایا۔ ملاحظہ ہو:

سید علی الجزائری اپنے زمانہ کے نامی گرامی شعلہ نفس خطیب تھے۔ پر ایک زمانہ ایسا آیا کہ انہوں نے خطاب کرنا یک سر ترک کر دیا اور زبان کو تالا دے لیا۔ تب لوگوں میں بے چینی ہوئی بے چینی بڑھی تو لوگ ان کی خدمت میں عرض پرداز ہوئے کہ خدارا خطاب فرمائیے۔ انہوں نے فرمایا کہ اچھا ہمارا منبر قبرستان میں رکھا جائے۔ اس نرالی ہدایت پر لوگ متعجب ہوئے۔ خیر منبر قبرستان میں رکھ دیا گیا۔ وہ قبرستان میں گئے اور منبر پر چڑھ کر ایک بلیغ خطبہ دیا۔ اس کا عجب اثر ہوا کہ قبروں سے درود کی صدا بلند ہوئی۔ تب سید علی الجزائری نے آبادی

کی طرف رخ کر کے گلوگیر آواز میں کہا۔اے شہر تجھ پر خدا کی رحمت ہو۔ تیرے جیتے لوگ بہرے ہوگئے اور تیرے مردوں کو سماعت مل گئی۔ یہ فرما کر وہ اس قدر روئے کہ داڑھی آنسوؤں سے تر ہو گئی اور اس کے بعد انہوں نے بستی سے کنارہ کیا اور قبرستان میں رہنے لگے، جہاں وہ مردوں کو خطبہ دیا کرتے تھے۔

یہ قصہ سن کر میں نے استفسار کیا، یا شیخ زندوں کی سماعت کب ختم ہوتی ہے اور مردوں کو کب کان ملتے ہیں۔؟اس پر آپ نے ٹھنڈا سانس بھرا اور فرمایا۔

یہ اسرار الٰہی ہیں۔ بندوں کو راز فاش کرنے کا اذن نہیں۔ پھر وہ پھڑ پھڑا کر اڑے اور املی کے درخت پر جا کر بیٹھے۔ جاننا چاہیے کہ شیخ عثمان کبوتر پرندوں کی طرح اڑا کرتے تھے اور اس گھر میں ایک املی کا پیڑ تھا کہ جاڑے، گرمی، برسات شیخ اسی کے سائے میں محفل ذکر کرتے۔ چھت کے نیچے بیٹھنے سے حزر تھا۔ فرمایا کرتے تھے کہ ایک چھت کے نیچے دم گھٹا جاتا ہے، دوسری چھت برداشت کرنے کے لیے کہاں سے تاب لائیں؟ یہ سن کر سید رضی پر وجد طاری ہوا اور اس نے اپنا گھر منہدم کر دیا اور ٹاٹ پہن کر املی کے نیچے آپڑا۔ سید رضی ابو سلم بغدادی، شیخ حمزہ، ابو جعفر شیرازی، حبیب بن یحییٰ ترمذی اور یہ بندہ حقیر شیخ کے مریدان فقیر تھے۔ میرے سوا باقی پانچوں مردان باصفا تھے اور فقر و قلندری ان کا مسلک تھا۔ شیخ حمزہ تجرد کی زندگی بسر کرتے تھے اور بے چھت کے مکان میں رہتے تھے۔ وہ شیخ کی تعلیم سے متاثر تھے اور کہتے تھے کہ چھت کے نیچے رہنا شرک ہے۔ چھت ایک ہے کہ وحدہ لاشریک نے پائی ہے۔ بندوں کو زیب نہیں کہ چھت کے مقابل چھت پائیں۔ ابو سلم بغدادی صاحبِ مرتبہ باپ کا بیٹا تھا۔ پھر گھر چھوڑ کر باپ سے ترک تعلق کر کے یہاں آ بیٹھا تھا اور کہا کرتا تھا کہ مرتبہ حقیقت کا حجاب ہے۔ ابو جعفر شیرازی نے ایک روز ذکر میں اپنا لباس تار تار کر دیا اور چٹائی کو نذرِ آتش کر دیا۔ اس نے کہا کہ چٹائی مٹی اور مٹی کے درمیان فاصلہ ہے اور لباس مٹی کو مٹی پر فوقیت دیتا ہے اور اس روز سے وہ ننگ دھڑنگ خاک پر بسیرا کرتا تھا اور ہمارے شیخ، کہ خاک ان کی مسند اور اینٹ ان کا تکیہ تھی، املی کے تنے کے سہارے بیٹھتے تھے اور اس عالم سفلی سے

بلند ہو گئے تھے۔ ذکر کرتے کرتے اڑتے، کبھی دیوار پر کبھی املی پر جا بیٹھتے کبھی اونچا اڑ جاتے اور فضا میں کھو جاتے۔ میں نے ایک روز استفسار کیا:

یا شیخ قوت پرواز آپ کو کیسے حاصل ہوئی؟ فرمایا:

عثمان نے طمع دنیا سے منہ موڑ لیا اور پستی سے اوپر اٹھ گیا۔ عرض کیا، یا شیخ طمع دنیا کیا ہے؟

فرمایا: طمع دنیا تیرا نفس ہے۔ عرض کیا: نفس کیا ہے؟ اس پر آپ نے یہ قصہ سنایا:

شیخ ابوالعباس اشقانی ایک روز گھر میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ ایک زرد کتا ان کے بستر میں سو رہا ہے۔ انہوں نے قیاس کیا کہ شاید محلّہ کا کوئی کتا اندر گھس آیا ہے۔ انہوں نے اسے نکالنے کا ارادہ کیا مگر وہ ان کے دامن میں گھس کر غائب ہو گیا۔

میں یہ سن کی عرض پرداز ہوا۔

یا شیخ زرد کتا کیا ہے؟ فرمایا:

زرد کتا تیرا نفس ہے۔۔ میں نے پوچھا: یا شیخ نفس کیا ہے؟ فرمایا:

نفس طمع دُنیا ہے۔ میں نے سوال کیا: یا شیخ طمع دُنیا کیا ہے؟ فرمایا:

پستی علم کا فقدان ہے۔ میں ملتجی ہوا: یا شیخ علم کا فقدان کیا ہے؟ فرمایا:

دانش مندوں کی بہتات۔ میں نے کہا: یا شیخ تفسیر کی جائے۔ آپ نے تفسیر بصورت حکایت فرمائی کہ نقل کرتا ہوں۔ پرانے زمانے میں ایک بادشاہ بہت سخی مشہور تھا۔ ایک روز اس کے دربار میں ایک شخص کہ دانش مند جانا جاتا تھا، حاضر ہو کر عرض پرداز ہوا کہ جہاں پناہ دانش مندوں کی بھی قدر چاہیے۔ بادشاہ نے اسے خلعت اور ساٹھ اشرفیاں دے کر بصد عزت رخصت کیا۔ اس خبر نے اشتہار پایا۔ ایک دوسرے شخص نے، کہ وہ اپنے آپ کو دانشمند جانتا تھا، دربار کا رُخ کیا اور بامراد پھرا۔ پھر تیسرا شخص، کہ اپنے آپ کو ابن دانش کے زمرہ میں شمار کرتا تھا، دربار کی طرف چلا اور خلعت لے کر واپس آیا۔ پھر تو ایک تانتا بندھ گیا جو جو اپنے آپ کو دانش مند گردانتے تھے جوق در جوق دربار میں پہنچتے تھے اور انعام لے کر واپس آتے تھے۔

اس بادشاہ کا وزیر بہت عاقل تھا۔ دانش مندوں کی یہ ریل پیل دیکھ کر اس نے ایک روز سر دربار ٹھنڈا سانس بھرا۔ بادشاہ نے اس پر نظر کی اور پوچھا کہ تو نے ٹھنڈا سانس کس باعث بھرا؟ اس نے ہاتھ جوڑ کر عرض کیا۔

جہاں پناہ! جان کی امان پاؤں تو عرض کروں۔

فرمایا۔ امان ملی۔ تو تب اس نے عرض کیا: خداوند نعمت سلطنت دانشمندوں سے خالی ہے۔

بادشاہ نے کہا: کمال تعجب ہے۔ تو روزانہ دانشمندوں کو یہاں آتے اور انعام پاتے دیکھتا ہے اور پھر بھی ایسا کہتا ہے۔

عاقل وزیر تب یوں گویا ہوا کہ اے آقائے ولی نعمت، گدھوں اور دانش مندوں کی ایک مثال ہے کہ جہاں سب گدھے ہو جائیں وہاں کوئی گدھا نہیں ہوتا اور جہاں سب دانش مند بن جائیں وہاں کوئی دانش مند نہیں رہتا۔

یہ حکایت سننے کے بعد میں نے سوال کیا: ایسا کب ہوتا ہے کہ سب دانش مند بن جائیں اور کوئی دانش مند نہ رہے؟ فرمایا: جب عالم اپنا علم چھپائے۔ سوال کیا کہ یا شیخ عالم اپنا علم کب چھپاتا ہے؟ فرمایا: جب جاہل عالم اور عالم جاہل قرار پائیں۔ سوال کیا کہ جاہل عالم اور عالم جاہل کب قرار پاتے ہیں؟ جواب میں آپ نے ایک حکایت بیان فرمائی جو اس طرح ہے:

ایک نامور عالم کو تنگ دستی نے بہت ستایا تو اس نے اپنے شہر سے دوسرے شہر ہجرت کی۔ اس دوسرے شہر میں ایک بزرگ رہتے تھے۔ انہوں نے اکابرین شہر کو خبر دی کہ فلاں دن، فلاں گھڑی ایک عالم اس شہر میں وارد ہوگا۔ اس کی تواضع کرنا اور خود سفر پر روانہ ہو گئے۔ اکابرین شہر مقررہ وقت پر بندرگاہ پہنچے۔ اسی وقت ایک جہاز آکر رکا۔ اس میں وہی عالم سفر کر رہا تھا۔ مگر ایک موچی بھی اس کا ہم سفر بن گیا تھا۔ وہ موچی حرام خور اور کاہل مزاج تھا۔ اس نے عالم کو سیدھا سادا دیکھ کر اپنا سامان ان پر لاد دیا اور چھڑی چھانٹ ہو گیا۔ جب جہاز سے دونوں اترے تو ایک ٹاٹ کے کرتے میں ملبوس کفش سازی کے سامان سے لدا پھندا تھا، اس پر کسی نے توجہ نہ دی دوسرے کو عزت واحترام سے اتارا اور ہمراہ لے گئے۔

وہ بزرگ جب سفر سے واپس آئے تو دیکھا کہ سڑک کے کنارے ایک شخص، جس کے چہرے پر علم و دانش کا نور عیاں ہے، جوتیاں گانٹھ رہا ہے۔ آگے گئے تو دیکھا کہ اکابرین و عمائدین کی ایک مجلس آراستہ ہے اور ایک بے بصیرت مسائل بیان کر رہا ہے۔ یہ دیکھ کر وہ بزرگ سر سے پاؤں تک کانپ گئے اور بولے:

اے شہر تیرا برا ہو، تو نے عالموں کو موچی اور موچیوں کو عالم بنادیا۔ پھر خود کفش سازی کا سامان خریداا ور اس عالم سے قریب ایک کوچے میں جوتیاں گانٹھنے بیٹھ گئے۔

یہ حکایت میں نے سنی اور سوال کیا۔ یا شیخ عالم کی پہچان کیا ہے؟

فرمایا! اس میں طمع نہ ہو۔

عرض کیا: طمع دنیا کب پیدا ہوتی ہے؟

فرمایا: جب علم گھٹ جائے۔

عرض کیا: علم کب گھٹتا ہے؟

فرمایا: جب درویش سوال کرے، شاعر غرض رکھے، دیوانہ ہوش مند ہو جائے، عالم تاجر بن جائے، دانش مند منافع کمائے۔ عین اس وقت ایک شخص لحن میں یہ شعر پڑھتا ہوا گزرا ے

چناں قحط سالے شد اندر دمشق
کہ یاراں فراموش کردند عشق

آپ نے اسے پکار کر کہا۔

اے فلانے یہ شعر پھر پڑھ۔ اس نے وہ شعر پھر پڑھا۔ پھر آپ پر مراقبے کا عالم طاری ہو گیا اور جب آپ نے سر اٹھایا تو یہ حکایت بیان فرمائی:

ایک شہر میں ایک منعم تھا۔ اس کی سخاوت کی بہت دھوم تھی۔ اس شہر میں ایک درویش، ایک شاعر، ایک عالم اور ایک دانش مند رہتا تھا۔ درویش پر ایک ایسا وقت آیا کہ اس پر تین دن فاقے میں گزر گئے۔ تب وہ منعم کے پاس جا کر سوالی ہوا اور منعم نے اس کا دامن بھر دیا۔ عالم کی بیوی نے درویش کو خوش حال دیکھا تو شوہر کو طعنے دینے شروع کیے کہ تمہارے علم کی

کیا قیمت ہے؟ تم سے تو وہ درویش اچھا ہے کہ منعم نے اس کا دامن دولت سے بھر دیا ہے۔ تب عالم نے منعم سے سوال کیا اور منعم نے اسے بھی بہت انعام واکرام دیا۔ دانش مند ان دنوں بہت مقروض تھا۔ اس نے درویش اور عالم کو امیر کے دروازے سے کامران آتے دیکھا تو وہ بھی وہاں جا پہنچا اور اپنی حاجت بیان کی۔ منعم نے اسے خلعت بخشی اور عزت سے رخصت کیا۔ شاعر نے یہ سنا تو زمانے کا بہت شاکی ہوا کہ سخن کی قدر دنیا سے اٹھ گئی اور اس نے منعم کے پاس جا کر اپنا کلام سنایا اور انعام کا طالب ہوا۔ منعم اس کا کلام سن کر خوش ہوا اور اس کا منہ موتیوں سے بھر دیا۔

درویش کو جو مل گیا تھا اسے اس نے عزیز جانا کہ پھر فاقوں کی نوبت نہ آئے اور بخل کرنا شروع کر دیا۔ عالم نے اسی دولت سے کچھ پس انداز کر کے کچھ اونٹ اور تھوڑا سا اسباب خریدا اور سوداگروں کے ہمرہ اصفہان، کہ نصف جہان ہے، روانہ ہوا اس سفر میں اسے منافع ہوا۔ تب اس نے مزید اونٹ اور مزید سامان خریدا اور خراسان کا سفر کیا۔ دانش مند نے قرض لینے اور ادا کرنے میں بڑا تجربہ حاصل کیا اور اپنا روپیہ سود پر چلانا شروع کر دیا۔ شاعر بہت کاہل نکلا، اس نے بس اتنا کیا کہ چند اشعار اور لکھ لیے، کچھ تہنیتی، کچھ شکایتی اور اسے مزید انعام مل گیا اور یوں درویش، عالم، دانش مند اور شاعر...... چاروں تونگر ہو گئے۔ مگر اس کے بعد ایسا ہوا کہ درویش کی درویشانہ شان، عالم کا علم، دانش مند کی دانش اور شاعر کے کلام کی سرستی جاتی رہی۔

شیخ نے یہ حکایت سنا کر توقف کیا۔ پھر فرمایا: حضرت شیخ سعدی نے بھی صحیح فرمایا اور میں شیخ عثمان کبوتر بھی صحیح کہتا ہوں کہ دمشق میں عشق فراموش دونوں صورت ہوا ہے۔ پھر وہ دیر تک اس شعر کو گنگناتے رہے اور اس روز اس کے بعد کوئی بات نہیں کی۔ معلوم ہو کہ ہمارے شیخ کی طبیعت میں گداز تھا اور دل درد سے معمور۔ شعر سنتے تھے تو کیفیت پیدا ہو جاتی تھی۔ جب بہت متاثر ہوتے تو رقت فرماتے اور گریبان چاک کر ڈالتے تھے۔ آخری شعر جو آپ نے سماعت فرمایا اس کا ذکر رقم کرتا ہوں۔

اس روز رات سے آپ پر اضطراب کا عالم تھا۔ شب بیداری آپ کا شیوہ تھا پر اس شب آپ نے گھڑی بھر بھی آرام نہیں فرمایا۔ میں نے گزارش کی تو فرمایا کہ مسافروں کو نیند

کہاں؟اور پھر تسبیح و تحلیل میں مستغرق ہو گئے۔ ابھی تڑکا تھا اور آپ فجر کا فریضہ ادا کر چکے تھے کہ ایک فقیر پر سوز لحن میں یہ شعر پڑھتا ہوا گزرا:

آگے کسو کے کیا کریں دستِ طمع دراز
وہ ہاتھ سو گیا ہے سرہانے دھرے دھرے

آپ پر رقت طاری ہو گئی، فرمایا: اے فلانے یہ شعر پھر پڑھ۔ اس نے وہ شعر پھر پڑھا۔ آپ نے گریبان چاک کر ڈالا۔ فرمایا۔ اے فلانے یہ شعر پھر پڑھ۔ فقیر نے شعر پھر پڑھا۔ آپ کا جی بھر آیا۔ دکھ بھری آواز میں بولے: افسوس ہے ان ہاتھوں پر بوجہ اس کے جو انہوں نے مانگا۔ افسوس ہے ان ہاتھوں پر بوجہ اس کے جو انہوں نے پایا اور آپ نے اپنے ہاتھ پر نظر فرمائی اور گویا ہوئے کہ اے میرے ہاتھ، گواہ رہنا کہ شیخ عثمان کبوتر نے تمہیں رسوائی سے محفوظ رکھا۔ وہ فقیر کہ ہم نے اس سے پہلے دیکھا تھا نہ سنا تھا، اندر آ گیا اور شیخ سے مخاطب ہوا کہ اے عثمان اب مرنا چاہیے کہ ہاتھ سوالی ہو گئے۔ آپ نے یہ سن کر گریہ کیا اور فرمایا۔ میں مر گیا اور پھر آپ نے اینٹ پر سر رکھا اور چادر تان کر ساکت ہو گئے۔

آپ نے اینٹ پر سر رکھ کر چادر تان لی اور آپ ساکت ہو گئے اور وہ فقیر جدھر سے آیا تھا ادھر چلا گیا اور میں بالیں پہ مشوش بیٹھا رہا۔ پھر مجھے لگا کہ چادر کے اندر کوئی شے پھڑکتی ہے۔ میں نے چادر کا کونہ اٹھایا۔ دفعتاً چادر کے اندر سے ایک سفید کبوتر پھڑک کر نکلا اور دم کے دم میں بلند ہو کر آسمان میں گم ہو گیا اور میں نے چادر کا کونہ اٹھا کر شیخ کے چہرۂ مبارک پر نظر ڈالی۔ اس چہرۂ مبارک پر اس آن عجب تجلی تھی۔ لگتا تھا کہ آپ خواب فرما رہے ہیں تب مجھ پر رقت طاری ہوئی اور میں نے وہ زاری کی کہ میں غش کر گیا۔

شیخ کے وصال شریف کا مجھ پر عجب اثر ہوا کہ میں اپنے حجرے میں بند ہو کر بیٹھ رہا۔ دنیا سے جی پھر گیا اور ہم جنسوں سے مل بیٹھنے کی آرزو مٹ گئی۔ جانے میں کتنے دن حجرہ نشین رہا۔ ایک شب شیخ، اللہ ان کی قبر نور سے بھرے، خواب میں تشریف لائے۔ آپ نے اوپر نظر فرمائی اور میں نے دیکھا کہ حجرے کی چھت کھل گئی ہے اور آسمان دکھائی دے رہا ہے۔

اس خواب کو میں نے ہدایت جانا اور دوسرے دن حجرے سے باہر نکل آیا۔

جانے میں کتنے دن حجرہ نشین رہا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ دنیا ہی بدل گئی ہے۔ بازار سے گزرا تو وہ رونق دیکھی کہ پہلے کبھی نہ دیکھی تھی۔ ہزاری بزاری، دکانیں صاف شفاف، صراف کے برابر صراف۔ سینکڑوں کا سودا دم کے دم میں ہوتا ہے۔ سوداگروں کی خدائی ہے۔ دولت کی گنگا بہتی ہے۔ میں نے آنکھیں مل کر دیکھا کہ یارب یہ عالم بیداری ہے یا خواب دیکھتا ہوں؟ کس شہر میں آگیا ہوں؟ تب میں نے سوچا کہ پیر بھائیوں سے ملنا چاہیے۔ حقیقت حال معلوم کرنا چاہیے۔ میں نے پہلے خانہ برباد سید رضی کا پتہ لیا۔ ڈھونڈ تا ڈھونڈ تا شہر کے ایک کوچے میں پہنچا اور ایک قصر کھڑا دیکھا۔ لوگوں نے کہا کہ سید رضی کا دولت کدہ یہی ہے۔ میں نے اس قصر کو دیکھا اور چلا کر کہا کہ خدا کی قسم، اے لوگو، تم نے مجھ سے جھوٹ کہا۔ سید رضی گھر نہیں بنا سکتا اور میں آگے بڑھ گیا۔ پھر میں نے ابوسلم بغدادی کا پتہ لیا۔ ایک شخص نے مجھے قاضی شہر کی محل سرائے کے سامنے جا کھڑا کیا اور کہا کہ ابوسلم بغدادی کا مسکن یہی ہے۔ میں نے اس محل سرائے کو دیکھا۔ اپنے تئیں حیران ہوا کہ ابوسلم بغدادی نے مرتبہ لے لیا۔ میں آگے بڑھ گیا اور شیخ حمزہ کا پتہ لیا۔ پتہ لیتے لیتے میں نے خود کو پھر ایک حویلی کے روبرو کھڑا پایا اور میں نے کہا کہ خدا کی قسم شیخ حمزہ نے چھت پاٹ لی۔ وہ مجھ سے دور ہو گیا۔ میں آگے بڑھا اور ابو جعفر شیرازی کا پتہ پوچھا۔ تب ایک شخص نے مجھے ایک جوہری کی دکان پر لے جا کھڑا کر دیا۔ جہاں قالین پر گاؤ تکیہ سے کمر لگا کر ریشمی پوشاک میں ملبوس ابو جعفر شیرازی بیٹھا تھا اور ایک طفل خوب رو اسے پنکھا کرتا تھا۔ تب میں نے چلا کر کہا: اے ابو جعفر! مٹی مٹی سے ممتاز ہو گئی اور میں جواب کا انتظار کیے بغیر مڑا اور وہاں سے آگیا۔ راستہ میں میں نے دیکھا کہ سید رضی ریشمی پوشاک میں ملبوس، غلاموں کی جلو میں بصد تمکنت سامنے سے چلا جاتا ہے اور دامن صبر میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ میں نے بڑھ کر اس کی عبا کے بھاری دامن کو اٹھایا اور کہا کہ اے بزرگ خاندان کی یادگار اے سید السادات تو نے ٹاٹ چھوڑ کر ریشم اوڑھ لیا! اس پر وہ محجوب ہوا اور میں وہاں سے روتا ہوا اپنے حجرے کی سمت چلا اور میں حجرہ میں آکر تادیر رویا اور

کہا کہ خدا کی قسم میں اکیلا رہ گیا ہوں۔

دوسرے دن میں نے شیخ کے مزار شریف پر حاضری دی۔ وہاں میں نے حبیب بن یحیٰ ترندی کو گلیم پوش اور بوریا نشین پایا۔ میں اس کے پاس بیٹھا اور کہا کہ اے حبیب تو نے دیکھا کہ دنیا کس طرح بدلی ہے اور رفقاء نے شیخ کی تعلیمات کو کیا فراموش کیا ہے اور کس طرح اپنے مسلک سے پھرے ہیں۔ وہ یہ سن کر افسوس کے آثار چہرے پر لایا اور آہ سرد بھر کر بولا کہ بیشک دنیا بدل گئی اور رفقاء نے شیخ کی تعلیمات کو فراموش کر دیا اور اپنے مسلک سے پھر گئے اور میں نے کہا کہ ہلاکت ہو بندۂ دینار کو اور ہلاکت ہو بندۂ درہم کو۔

اسی روز شام کو ابوسلم بغدادی کا قاصد مجھے بلانے آیا کہ چل تیرا پرانا رفیق بلاتا ہے، اور میں وہاں گیا تو میں نے حبیب بن یحیٰ ترندی کو اس کی صحبت میں بیٹھا پایا اور ابوسلم بغدادی نے پیشانی پر شکن ڈال کے کہا کہ اے ابوالقاسم خضری تو ہمیں شیخ کی تعلیمات سے منحرف بتاتا ہے اور ہلاکت ہلاکت کے نعرے لگاتا ہے۔ اس پر میں نے حبیب بن یحیٰ پر غصہ کی نظر ڈالی اور پھر ابوسلم بغدادی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا کہ ابوسلم کیا تو مجھے وہ کہنے سے منع کرے گا جو رسول نے کہا اور جسے شیخ نے ورد کیا اور پھر میں نے پوری حدیث پڑھی۔

ہلاکت ہو بندۂ دینار کو اور ہلاکت ہو بندۂ درہم کو اور ہلاکت ہو بندۂ گلیم سیاہ کو اور پھٹے لباس کے بندے کو۔ اسی اثناء میں دستر خوان بچھا اور اس پر انواع و اوان کے کھانے چنے گئے۔ ابوسلم بغدادی نے کہا:

اے رفیق کھانا تناول کر۔ میں نے ٹھنڈا پانی پینے پر قناعت کی اور کہا۔

اے ابوسلم بغدادی دنیا دن ہے اور ہم اس میں روزہ دار ہیں۔ ابوسلم بغدادی یہ سن کر رویا اور بولا۔

سچ کہا تو نے اے ابوالقاسم، اور پھر کھانا تناول کیا اور حبیب بن یحیٰ ترندی بھی یہ سن کر رویا اور حبیب بن یحیٰ ترندی نے بھی پیٹ بھر کر کھایا۔ جب دستر خوان تہہ ہوا تو کنیزوں کی جلو میں ایک رقاصہ آئی۔ میں اسے دیکھ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ ابوسلم بغدادی نے اصرار کیا اے

رفیق ٹھہر۔ میں نے کہا کہ اے ابوسلم بغدادی دنیا دن ہے اور ہم روزہ دار ہیں اور میں وہاں سے چلا آیا اور اس چھنال کے پیروں کی دھمک اور گھنگھروؤں کی جھنکار نے میرا تعاقب کیا۔ پھر میں نے کانوں میں انگلیاں لے لیں اور بڑھے چلا گیا۔

جب میں نے حجرے میں قدم رکھا تو دفعتہً ایک لجلجی شے تڑپ کر میرے حلق سے نکلی اور منہ سے باہر نکل آئی۔ میں نے چراغ روشن کیا اور حجرے کا کونہ کونہ دیکھا مگر کچھ نہ دِکھائی دیا اور میں نے کہا: بیشک یہ میرا وہم تھا اور میں چٹائی پر پہنچ کر سو رہا۔

دوسرے روز میں اٹھ کر پہلے حبیب بن یحیٰؔ ترمذی کی طرف گیا اور میں نے دیکھا کہ اس کے بوریے پر ایک زرد کتا سو رہا ہے۔ میں نے کہا: اے یحیٰؔ ترمذی کے بیٹے تو نے اپنے تیئں نفس کے حوالے کر دیا اور منافق ہو گیا۔ اس پر وہ رویا اور کہا کہ خدا کی قسم میں تیرے ساتھیوں میں سے ہوں اور رفقاء کے پاس مسلک شیخ یاد دلانے جاتا ہوں۔ تب میں نے شیخ کی قبر پر کہ خدا اس کو نور سے بھر دے، عقیدت مندوں کو زر و سیم چڑھاتے دیکھا اور میں نے کہا:

اے یحیٰؔ کے بیٹے تیرا برا ہو تو نے شیخ کو وصال کے بعد اہل زر بنا دیا۔ اس سیم و زر کا تو کیا کرتا ہے! حبیب بن ترمذی پھر رویا اور کہا کہ خدا کی قسم یہ زر و سیم سید رضی، ابو جعفر شیرازی، ابوسلم بغدادی، شیخ حمزہ اور میرے درمیان مساوی تقسیم ہوتا ہے اور میں اپنا حصہ مساکین میں تقسیم کر دیتا ہوں اور بوریے کو اپنی تقدیر جانتا ہوں۔

میں وہاں سے اٹھ کر آگے چلا اور میں نے سید رضی کے قصر کے سامنے سے گزرتے ہوئے دیکھا کہ اس کے پھاٹک میں ایک بڑا سا زرد کتا کھڑا ہے اور میں نے اس زرد کتے کو شیخ حمزہ کی حویلی کے سامنے کھڑا پایا اور ابو جعفر شیرازی کی مسند پر محو خواب پایا اور ابوسلم بغدادی کی محل سرا میں دم اٹھائے کھڑے دیکھا اور میں نے اپنے تیئں سوال کیا۔ اے ابوالقاسم تو یہاں کیوں آیا ہے؟ اور ابوالقاسم نے مجھ سے کہا کہ ابوسلم بغدادی کو مسلک شیخ کی دعوت دینے کے لیے۔

اس رات بھی میں نے حبیب بن یحیٰؔ ترمذی کو ابوسلم بغدادی کے دسترخوان پر موجود

پایا۔ ابوسلم بغدادی نے مجھ سے کہا کہ اے رفیق کھانا تناول کر اور میں نے ٹھنڈے پانی پر قناعت کی اور کہا کہ اے ابوسلم دنیا دن ہے اور ہم اس میں روزہ دار ہیں۔ اس پر سلم بغدادی رویا اور بولا۔ سچ کہا تو نے اے رفیق، اور پھر جب زن رقاصہ آئی تب بھی میں نے یہی کیا اور اٹھ کھڑا ہوا اور اس زن رقاصہ کے پیروں کی تھاپ اور گھنگھروؤں کی جھنکار نے کچھ دور تک میرا تعاقب کیا۔ مگر پھر میں نے کانوں میں انگلیاں دے لیں اور آگے بڑھ گیا۔

تیسرے دن میں نے پھر شہر کا گشت کیا اور جو منظر پچھلے دو دن دیکھتا آرہا تھا۔ اس میں سرمو فرق نہ دیکھا اور شب کو میں نے پھر اپنے تئیں ابوسلم بغدادی کے در پر کھڑا پایا۔ مجھے معلوم تھا کہ میں ابوسلم بغدادی کو شیخ کی تعلیمات یاد دلانے آیا ہوں۔ سو میں نے اپنے تئیں کوئی سوال نہیں کیا اور اندر چلا گیا۔ آج پھر حبیب بن یحیٰ ترمذی دستر خوان پر موجود تھا۔ ابوسلم بغدادی نے کہا اے رفیق کھانا تناول کر، اور مجھے آج تیسرا فاقہ تھا اور دستر خوان پر منجملہ اور غذاؤں کے مزعفر بھی تھا جو ایک زمانے میں مجھے بہت مرغوب تھا۔ میں نے ایک نوالہ مزعفر کا لے کر ہاتھ کھینچ لیا اور ٹھنڈا پانی پیا اور کہا:

دنیا دن ہے اور ہم اس میں روزہ دار ہیں۔

آج یہ فقرہ سن کر ابوسلم بغدادی نے رونے کے بجائے اطمینان کا سانس لیا اور کہا: اے رفیق تو نے سچ کہا۔ پھر زن رقاصہ آئی اور میں نے اسے ایک نظر دیکھا۔ چہرہ لال بھبوکا، آنکھیں مے کی پیالیاں، کچیں سخت اور رانیں بھری ہوئی، پیٹ صندل کی تختی، ناف گول پیالہ ایسی، اور لباس اس نے ایسا باریک پہنا تھا کہ صندل کی تختی اور گول پیالہ اور کولھے، سیمیں ساقیں سب نمایاں تھیں اور مجھے لگا کہ میں نے مہکتے مزعفر کا ایک اور نوالہ لے لیا ہے اور میرے پوروؤں میں کن من ہونے لگی اور میرے ہاتھ میرے اختیار سے باہر ہونے لگے۔ تب مجھے ہاتھوں کے بارے میں شیخ کا ارشاد یاد آیا۔ میں گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا کہ آج ابوسلم بغدادی نے کھانے پر اصرار نہ کیا اور آج اس رنڈی کے پیروں کی تھاپ اور گھنگھروؤں کی جھنکار نے ایک شیریں کیفیت کے ساتھ میرا دور تک تعاقب کیا۔

جب میں گھر پہنچا اور حجرے میں قدم رکھا تو کیا دیکھتا ہوں کہ میرے بوریے پر ایک زرد کتا سو رہا ہے۔ میں تو اسے دیکھ کر نقش کالجر بن گیا اور مجھے ٹھنڈا ٹھنڈا پسینہ آنے لگا۔ پھر میں نے اسے مارا پر وہ بھاگنے کی بجائے میرے دامن میں آ کر گم ہو گیا۔ تب مجھے اندیشوں نے گھیرا میری آنکھوں کی نیند غائب اور دل کا چین رخصت ہو گیا اور میں نے زاری کی۔ اے میرے معبود مجھ پر رحم کر کہ میرا دل آلائشوں میں مبتلا ہوا اور زرد کتا میرے اندر سما گیا۔ میں نے زاری کی اور میں نے دعا کی۔ پر میرے جی کو قرار نہ آیا۔ یک بارگی مجھے ابو علی رودباری رضی اللہ عنہ، یاد آئے کہ کچھ مدت وسوسہ کی بیماری میں مبتلا رہے تھے۔ ایک دن وہ صبح نور کے تڑکے دریا پر گئے اور سورج نکلنے تک وہاں رہے۔ اس عرصہ میں ان کا دل اندوہ گیں ہوا۔ انہوں نے عرض کیا: اے بار خدایا آرام دے۔ دریا میں سے ہاتف نے آواز دی کیا آرام علم میں ہے اور میں نے خود سے کہا کہ اے ابو القاسم خضری یہاں سے چل کہ یہاں تیرے باہر اور اندر زرد کتے پیدا ہو گئے اور تیرا آرام چھن گیا۔

میں نے اپنے حجرے پر آخری نظر ڈالی اور منطق اور فقہ کی ان نادر کتب کو، جو برسوں کی ریاضت سے جمع کی تھیں، وہیں چھوڑ، ملفوظات شیخ بغل میں دبا، شہر سے نکل گیا۔ شہر سے نکلتے نکلتے زمین نے میرے پیر پکڑ لیے اور مجھے شیخ کی خوشبودار مجلسیں بے طرح یاد آ گئیں اور اس زمین نے، جسے میں نے پاک اور مقدس جانا تھا۔ مجھے بہت پکڑا اور ان گلیوں نے جنہوں نے شیخ کے قدموں کو بوسہ دیا تھا، مجھے بہت پکارا اور میں ان کی پکار سن کر رویا اور بکا کی کہ یا شیخ تیرا شہر چھتوں میں چھپ گیا اور آسمان دور ہو گیا اور تیرے رفیقانِ گریز پا تجھ سے پھر گئے۔ انہوں نے لا شریک چھت کے مقابل اپنی اپنی چھتیں پاٹ لیں اور مٹی میں فصل پیدا کر دیا اور زرد کتے نے عزت پائی اور اشرف الخلق مٹی بن گیا اور مجھ پر تیرا شہر تنگ ہو گیا۔ میں نے تیرا شہر چھوڑ دیا۔ یہ کہہ کر میں نے دل مضبوط کیا اور چل پڑا۔

میں چلتے چلتے دور نکل گیا۔ یہاں تک کہ میرا دم پھول گیا اور میرے پیروں میں چھالے پڑ گئے۔ مگر ایسا ہوا کہ اچانک میرے حلق سے کوئی چیز زور کر کے باہر آ گئی اور پیروں

پر گر گئی۔ میں نے اپنے پیروں پر نظر کی اور یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ ایک لومڑی کا بچہ میرے قدموں پر لوٹتا ہے۔ تب میں نے اسے پیروں سے روند کر کچل دینا چاہا۔ پر وہ لومڑی کا بچہ پھول کر موٹا ہو گیا۔ تب میں نے اسے پھر قدموں سے روندا اور وہ موٹا ہو گیا اور موٹا ہوتے ہوتے زرد کتا بن گیا۔ تب میں نے پوری قوت سے زرد کتے کو ٹھوکر ماری اور اسے قدموں سے خوب روندا اور روندتا ہوا آگے نکل گیا اور میں نے کہا کہ خدا کی قسم میں نے اپنے زرد کتے کو روند ڈالا اور میں چلتا ہی گیا تا آنکہ میرے چھالے چھل کر پھوڑا بن گئے اور میرے پیروں کی انگلیاں پھٹ گئیں اور تلوے لہو لہان ہو گئے۔ مگر پھر ایسا ہوا کہ زرد کتا، جسے میں روند کر آیا تھا جانے کدھر سے پھر نکل آیا اور میرا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔ میں اس سے لڑا اور اسے راہ سے بہت ہٹایا۔ پر وہ راہ سے سرمو نہ ہٹا، حتیٰ کہ میں تھک گیا اور تھک کر گھٹ گیا اور وہ زرد کتا پھول کر بڑا ہو گیا۔ تب میں نے بارگاہِ رب العزت میں فریاد کی کہ اے پالنے والے آدمی گھٹ گیا اور زرد کتا بڑا ہو گیا اور میں نے اسے قدموں میں روندنا چاہا پر وہ میرے دامن میں لپٹ کر غائب ہو گیا اور میں نے اپنی پھٹی ہوئی انگلیوں اور لہو لہان تلوؤں اور پھوڑا چھالوں پر نظر کی اور اپنے حال پر رویا اور کہا کہ کاش میں نے شیخ کے شہر سے ہجرت نہ کی ہوتی۔ تب میرا دھیان اور طرف گیا۔ میں نے مہکتے مزعفر کا خیال کیا اور صندل کی تختی اور گول پیالہ والی کا تصور باندھا اور شیخ کے مزار پر زر و سیم کی بارش پر قیاس دوڑایا اور میں نے سوچا کہ بیشک شیخ کے مرید شیخ کی تعلیمات سے منحرف ہو گئے اور حبیب بن یحییٰ ترمذی نے مخالفت کی راہ اختیار کی اور بیشک شیخ کی ملفوظات میرے تصرف میں ہیں، مناسب ہو کہ میں شہر واپس چل کر ملفوظات پر نظر ثانی کروں اور انہیں مرغوب خلائق اور پسند خاطر احباب بنا کر ان کی اشاعت کی تدبیر کروں اور شیخ کا تذکرہ اس طرح لکھوں کہ رفقاء کو پسند آئے اور طبیعت پر کسی کی میل نہ آئے پر مجھے اس آن اچانک شیخ کا ارشاد یاد آیا کہ ہاتھ آدمی کے دشمن ہیں اور میں نے سوچا کہ میرے ہاتھ مجھ سے دشمنی کریں گے اور اسی رات جب میں نے سونے کی نیت باندھی تو میں نے دیکھا کہ زرد کتا پھر نمودار ہو گیا ہے اور میری چٹائی پر سو رہا ہے۔ تب میں نے زرد کتے کو

مارا اور اسے اپنی چٹائی سے اٹھانے کے لیے اس سے نبرد آزما ہوا اور میں اور زرد کتا رات بھر لڑتے رہے۔ کبھی میں اسے قدموں میں روند ڈالتا اور وہ چھوٹا اور میں بڑا ہو جاتا، کبھی وہ اٹھ کھڑا ہوتا اور میں چھوٹا اور وہ بڑا ہو جاتا۔ یہاں تک کہ صبح ہو گئی اور اس کا زور گھٹنے لگا اور وہ میرے دامن میں چھپ کر غائب ہو گیا۔

تب سے اب تک میری اور زرد کتے کی لڑائی چلی آتی ہے۔ اس مجاہدہ کی فرعیں بہت اور باریکیاں بے شمار ہیں جنہیں میں نظر انداز کرتا ہوں کہ رسالہ لمبا نہ ہو جائے۔ کبھی زرد کتا مجھ پر اور کبھی میں زرد کتے پر غالب آ جاتا ہوں۔ کبھی میں بڑا ہوتا اور وہ میرے قدموں میں پس کر لومڑی کا بچہ ایسا رہ جاتا ہے۔ کبھی وہ بڑا ہوتا چلا جاتا ہے اور میں گھٹے چلا جاتا ہوں اور مجھے مہکتے ہوئے مزعفر اور صندل کی تختی اور گول پیالے کا خیال ستانے لگتا ہے اور زرد کتا کہتا ہے کہ جب سب زرد کتے بن جائیں تو آدمی بنے رہنا کتے سے بدتر ہوتا ہے اور میں فریاد کرتا ہوں کہ اے پالنے والے میں کب تک درختوں کے سائے میں بنی آدم سے دُور دُور پھروں اور کچے پکے پھلوں اور موٹے ٹاٹ کی گدڑی پر گزارہ کروں اور میرے قدم شہر کی طرف اٹھنے لگتے ہیں۔ پر مجھے شیخ کا ارشاد یاد آ جاتا ہے کہ واپس ہوتے ہوئے قدم سالک کے دشمن ہیں اور میں پھر اپنے قدموں کو سزا دیتا ہوں اور شہر کی طرف پشت کر کے اتنا چلتا ہوں کہ میرے تلوے لہولہان ہو جاتے ہیں اور پھر ہاتھوں کو سزا دیتا ہوں کہ راستے کے پتھر کنکر چنتا ہوں۔ اے رب العزت میں نے اپنے دشمنوں کو اتنی سزا دی کہ میرے تلوے لہولہان ہو گئے اور میرے پوروے کنکر چنتے چنتے پھوڑا بن گئے اور میری چمڑی دھوپ میں کالی پڑ گئی اور میری ہڈیاں پگھلنے لگیں۔ اے رب العزت میری نیندیں جل گئیں اور دن ملیا میٹ ہو گئے۔ دنیا میرے لیے تپتا دن بن گئی اور میں روزہ دار ٹھہرا اور روزہ دن دن لمبا ہوتا جاتا ہے۔ اس روزے سے میں لاغر ہو گیا۔ مگر زرد کتا تو آتا ہے اور روز رات کو میری چٹائی پر آرام کرتا ہے۔ میرا آرام رخصت ہو گیا اور میری چٹائی غیر کے قبضہ میں چلی گئی اور زرد کتا بڑا اور آدمی حقیر ہو گیا اور اس وقت میں نے ابو علی رودباری رضی اللہ عنہٗ کو پھر یاد کیا اور دریا

کے کنارے دوزانو بیٹھ گیا۔ میرا دل اندر سے بھرا ہوا تھا اور میں نے بکا کی کہ بارِالٰہ آرام دے، آرام دے، آرام دے۔ میں نے رات بھر بکا کی اور دریا کی طرف دیکھا کیا اور رات بھر غبار آلود تیز ہوا زرد رو پیڑوں کے درمیان چلی اور رات بھر درختوں سے پتے گرا کیے۔ میں نے دریا سے نظر ہٹا کر اپنے گرد میں اٹے جسم کو دیکھا، اپنے ارد گرد زرد پتوں کی ڈھیریاں دیکھیں اور میں نے کہا کہ یہ میری خواہشیں اور ارمان ہیں۔ خدا کی قسم میں آلائشوں سے پاک ہوا اور پت جھڑ کا برہنہ درخت بن گیا پر جب تڑکا ہوا تو مجھے اپنے پوروؤں میں میٹھا میٹھا رَس گھلتا محسوس ہوا، جیسے وہ صندل کی تختی سے چھو گئے ہیں، جیسے انہوں نے گول سنہری پیالے اور نرم نرم چاندی سی ساقوں کو مَس کیا ہے، جیسے انگلیاں سونے چاندی میں کھیل رہی ہیں اور ان کے درمیان درہم و دینار کھنک رہے ہیں۔ میں نے آنکھیں کھولیں اور دھندلکے میں یہ دہشت بھرا منظر دیکھا کہ زرد کتا دُم اٹھائے اس طور کھڑا ہے کہ اس کی پچھلی ٹانگیں شہر میں ہیں اور اگلی ٹانگیں میری چٹائی پر اور اس کے گیلے گرم نتھنے میرے دائیں ہاتھ کی انگلیوں کو چھو رہے ہیں۔ میں نے اپنے دائیں ہاتھ کو یوں دیکھا جیسے وہ ابو سعید رحمۃ اللہ علیہ کے ہاتھوں کی مثال کٹا ہوا مجھ سے الگ پڑا ہے اور میں نے اسے خطاب کر کے کہا کہ اے میرے ہاتھ! میرے رفیق تو دشمن سے مل گیا اور میں نے آنکھیں بند کر لیں اور گڑگڑا کر ایک بار پھر دعا کی: بارِالٰہ آرام دے، آرام دے، آرام دے۔ ☐☐

انور سجّاد

انور سجاد ۲۷ر مئی ۱۹۳۵ء کو لاہور میں
پیدا ہوئے۔ ایم۔ بی۔ بی۔ ایس ہیں۔
تخلیقات میں "خوشیوں کا باغ" (ناول)
"رگِ سنگ" (ناولٹ) اور "چوراہا"،
"استعارے"، "آج" (افسانوی مجموعے)
شامل ہیں۔ انور سجاد ٹی وی اور ریڈیو کے
لیے بھی ڈرامے اور سیریل لکھتے ہیں۔ "پریذیڈنٹ آف پاکستان ایوارڈ" اور "پرائڈ
آف پرفارمنس" کے دو نیشنل ایوارڈوں سے سرفراز کیے جا چکے ہیں۔ افسانہ، ناول اور
ڈرامہ پر ان کے تنقیدی مضامین بہت سنجیدہ شوق سے پڑھے جاتے ہیں۔ "گائے"
پہلی بار رسالہ "فنون" جون ۱۹۶۸ء میں شائع ہوا۔

گائے

انور سجاد

ایک روز انہوں نے مل کر فیصلہ کیا تھا کہ اب گائے کو بوچڑ خانے میں دے ہی دیا جائے۔ اب اس کا دھیلا نہیں ملنا۔

ان میں سے ایک نے کہا تھا۔

ان مٹھی بھر ہڈیوں کو کون خریدے گا۔

لیکن بابا مجھے اب بھی یقین ہے۔ اگر اس کا علاج باقاعدگی سے۔

تم چپ رہو جی۔ بڑے آئے عقل والے۔

نکا چپ کر کے ایک طرف ہو گیا تھا اور بابا اپنی داڑھی میں عقل کو کریدتا ہوا اس کے بڑوں کے ساتھ سر جوڑ کر بیٹھ گیا تھا۔

میں جب زبان ہلاتا ہوں تو یہ بوچڑ بن جاتے ہیں جس روز سے میں نے ان کو پہچانا ہے، اسی روز سے چتکبری کو بھی جانا ہے اور جس دن سے یہ لوگ اسے بوچڑ خانے لے جانے کی سوچ رہے ہیں اس دن سے میں ہر لمحہ یتیم ہوتا ہوں۔ میں کیا کروں یہ سب مجھ پر ہنستے ہیں کہ میں اس کی اتنی خدمت کیوں کرتا ہوں۔ ان ہڈیوں سے اتنا پیار کیوں کرتا ہوں، کیوں کرتا ہوں؟

آپ اسے بوچڑ خانے کے بجائے ہسپتال کیوں نہیں بھیج دیتے؟

ننگے سے رہا نہیں جاتا تھا۔

تم نہیں سمجھتے یہ ٹھیک نہیں ہوسکتی۔ اس کے علاج پر پیسہ خواہ مخواہ کیوں برباد کیا جائے؟

میں نا سمجھ ہوں ابھی کل ہی تو ماں نے دھاگے میں پندرھویں گرہ لگائی ہے۔

آپ علاج کرا کے دیکھیں تو سہی۔

بڑوں کی باتوں میں دخل نہ دیا کرو۔

میرا جی چاہتا ہے کہ میں آپ سب کو بوچڑ خانے دے آؤں۔

پھر سب نے مل کر گائے کی زنجیر پکڑی تھی۔ لیکن جیسے گائے کو بھی سب کچھ معلوم تھا وہ اپنی جگہ سے ایک انچ نہیں ہلی تھی۔ انہوں نے مار مار کے اس کا بھرکس نکال دیا تھا۔ ننگا ایک طرف کھڑا پتھرائی ہوئی آنکھوں سے سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

شاباش میری چتکبری میری گائے میری گئو ماتا، ہلنا نہیں، تم نہیں جانتیں یہ لوگ تمہارے ساتھ کیا سلوک کرنے والے ہیں۔ جانا نہیں ہلنا نہیں ورنہ، ورنہ نہیں تو۔

گائے اپنی جگہ پر اڑی، مڑ مڑ کے اس کی طرف دیکھتی رہی تھی۔ ذرا ہٹ کر گائے کا بچھڑا کھونٹے کے ساتھ رسّی سے بندھا بے تعلق بیٹھا تھا۔ ہڈیوں پر لاٹھیوں کی بوچھاڑ اسے نہیں سنائی دیتی تھی۔ ننگے کے کان بھی بند ہو رہے تھے، رفتہ رفتہ۔

سارے بزرگ ہانپتے ہوئے پھر سر جوڑ کر بیٹھ گئے تھے۔ پھر فیصلہ ہوا تھا کہ اگر یہ اب

چل بھی پڑے تو ممکن ہے راستے میں کھمبا ہو جائے اس لیے بہتر یہی ہے کہ اسے ٹرک میں ڈال کر لے جایا جائے۔ ٹرک میں تو اسے اٹھا کر لادا جا سکتا ہے۔

اگلے روز ٹرک بھی آ گیا تھا۔

ٹرک کی آواز پر گائے نے مڑ کے دیکھا تھا۔ آنکھیں جھپکی تھیں اور کھرلی میں منہ ڈال دیا تھا جہاں نکا چارہ ڈال کے ابھی ابھی ٹرک کو دیکھنے گیا تھا۔

آپ لوگ اسے واقعی۔

اسے یقین نہیں آتا تھا۔

نہیں تو ہم مذاق کر رہے ہیں کیا؟

ایک نے کہا تھا۔

بابا، یہ گائے مجھے دے دو، میں اسے۔

حکیم کی اولاد۔

دوسرے نے کہا تھا۔

بابا اس کے بغیر میں۔

مجنوں کا بچہ۔

تیسرے نے کہا تھا۔

چوتھا، پانچواں سارے بزرگ، سارے بزرگ سالے ایک سے ہیں اور بابا جو اپنی داڑھی کو عقل کا گڑھ سمجھتا ہے جانے اسے کیا ہو گیا ہے۔

بیٹے ٹرک والے کو دس روپے دے کر بھی ہم بہت فائدے میں رہیں گے۔

اور کمبخت سوداگر مجھ سے لو روپے، مجھ سے یہ لو لیکن میری مٹھی میں اس وقت تو ہوا ہے جب، جب میں بڑا ہو جاؤں گا۔

ہا—ہا—ہا—ہا۔

جب، جب میں کمانے لگوں گا۔

ہا-ہا-ہا-ہا۔

تب، تب تک تو چتکبری کی ہڈیوں کا سرمہ بن گیا ہو گا۔ میں، میں کیا کروں۔

ان میں سے ایک، گائے کو لانے کے لیے کھرلی کی طرف گیا تھا۔ نکّا بھی اس کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔ یونہی دیکھنے کے لیے۔ بڑے نے اس کی زنجیر کھولی تھی۔ گائے نے کھرلی میں منہ مار کے دانتوں میں پٹھے دبائے تھے، مڑ کے نکّے کو دیکھا تھا اور جانے کے لیے کُھر اٹھایا تھا۔

نہ، نہ، نہ۔

نکّا چیخا تھا۔

بکو مت۔

گائے کھڑی ہو گئی تھی۔

ہے-ہے-ہے۔

بڑے نے زور لگایا تھا۔

نہ چتکبرے-نہ-نہ۔

چپ بھی کرو گے یا کھینچوں تمہاری زبان۔

نکّے نے زبان کو قید کر دیا تھا۔ بڑے نے پھر زنجیر کو جھٹکا دیا تھا۔

چلو میم صاحب! ٹرک والا تمہارے باپ کا نوکر نہیں جو سارا دن کھڑا رہے۔

گائے کی آنکھیں باہر کو نکل آئی تھیں۔ زبان، قید میں پھڑ پھڑا کے رہ گئی تھی۔ لیکن وہ مشت استخواں وہیں کی وہیں تھی۔ نکّا مسکرایا۔ پھر فوراً ہی اُداس ہو گیا تھا۔

یہ تو یہ تو بِک بھی چکی ہے اسے جانا ہی ہو گا مجھے اب بھی یقین ہے کہ اگر تھوڑی سی رقم لگا کے اس کا علاج باقاعدگی سے کیا جائے تو، لیکن میں ان بزرگوں کا کیا کروں کاش میں حکیم ہی ہوتا۔ اس بچھڑے کو شرم نہیں آتی ماں کے جسم پر نیل پڑ رہے ہیں اور یہ باہر کھڑا الّو کے پٹھوں کی طرح دیکھے جا رہا ہے۔

زبان پھڑ پھڑا کے رہ گئی تھی۔

پھر ان میں سے ایک کو بڑی اچھی سوجھی تھی۔ اس نے گائے کی دُم پکڑ کر اسے تین چار بل دیے تھے۔ وہ پیٹھ کے درد سے دور بھاگی تھی۔ اس نے نکّے کی طرف دیکھ کر قہقہہ لگایا تھا۔ پیٹھ کا درد گائے کو ہانکتا ہوا بالکل ٹرک کے پاس لے آیا تھا۔ نکّے کا دل بہت زور سے دھڑ کا تھا۔

در فٹے منہ، لعنت لکھ لعنت۔

ٹرک والے نے گائے کے چڑھنے کے لیے ٹرک سے زمین پر تختہ لگا دیا تھا۔ گائے نے تختے پر کھر رکھا۔

نہ چڑھنا۔

اس کی زبان کاٹ لو۔ یہ گائے کو ورغلاتا ہے۔

ڈراتا ہے۔

نکا پھر منہ بند کر کے پیچھے ہٹ گیا تھا۔ گائے نے تختے کو دیکھا، پھر نکّے کی طرف۔

در فٹے منہ، لعنت لکھ لعنت۔

نکّے کا سر شرم سے جھک گیا تھا۔

اس کے علاوہ میں اور کیا کر سکتا ہوں، کیا کر سکتا ہوں۔

وہ ابھی تک نہیں ڈری تھی۔ پھر اس نے مشکوک نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھ کر بڑے زور سے پھنکار ماری تھی۔

میری چتکبری جانتی ہے، جانتی ہے کہ وہ تختے پر قدم رکھ کر ٹرک میں چلی جائے گی لیکن وہ یہ نہیں جانتی کیوں، کیوں وہ چڑھنا نہیں چاہتی۔

ان سب نے مل کر اس کی پیٹھ پر لاٹھیاں برسائی تھیں، گائے کی ٹانگیں تھرکی تھیں لیکن وہ اپنی جگہ سے قطعی نہیں ہلی تھی۔ جب انہوں نے مل کر دوسرا وار کیا تو وہ تکلیف سے دور بھاگنے کو تھی کہ بابا کی داڑھی میں عقل نے جوش مارا تھا اور اس نے جما کر اس کے منہ پر لاٹھی ماری تھی۔ گائے پھر تختے کی طرف منہ کر کے سیدھی ہو گئی تھی۔ بابا نے ہانپتے ہوئے کہا تھا۔

آؤ پیٹو۔
اور ان سب نے مل کر پھر لاٹھیوں کا مینہ برسایا تھا۔
نکّا دور کھڑا تھا۔ بالکل بے تعلق بے حس۔
یوں بات نہیں بنے گی۔
ایک نے اپنی سانس پر قابو پاتے ہوئے کہا تھا۔
تو پھر؟

وہ ٹرک کے ساتھ ٹیک لگائے کھڑے سوچ ہی رہے تھے کہ جانے گائے کو کیا سوجھی تھی، پلٹ کر یکدم بھاگ اٹھی تھی اور دھول اڑاتی نکّے کے قریب سے بالکل اجنبیوں کی طرح گزر گئی تھی۔

نکّا۔ جسم کا مفلوج حصہ۔
دیکھو، دیکھو، وہ تو بائیں طرف۔
ایک چونکا تھا۔
قدرتی بات ہے۔
بابا نے اپنی داڑھی میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا تھا۔
گائے اپنے بچھڑے کو چاٹ رہی تھی۔ بابا کی آنکھیں مکّارسی مسکراہٹ سے چمک اٹھیں۔
اس بچھڑے کو یہاں لے آؤ --- یہ چال تو ہمیں کل ہی چل جانی چاہیے تھی۔ ٹرک کے پیسے بھی بچ جاتے۔
نکّا --- مفلوج وجود۔

ان میں سے ایک نے بچھڑے کی رسّی پکڑی تھی۔ نکّے کی زبان لرزی تھی۔ گائے کچھ سوچتی، قدم اٹھاتی، رکتی چلتی بچھڑے کے پیچھے پیچھے اس کے قریب سے گزری تھی تو آہستہ سے نکّے کی زبان سے گالی پھسلی تھی۔ بچھڑا، تختے پر چڑھ کے پٹوسیاں مارتا ہوا ٹرک میں چلا گیا تھا۔ گائے تختے کے پاس جا کے پھر رکی تھی۔ بڑی حیرانی سے بچھڑے کو دیکھ کر آہستہ آہستہ

گردن موڑ کے نکّے کو دیکھا تھا۔ ایک نے فوراً بغل سے پٹھوں کا گٹھا نکال کر گائے کے آگے کر دیا تھا۔ اس نے چند ڈنٹھل دانتوں میں لے لیے اور پھر کچھ سوچ کر زمین پر گرا دیے تھے اور اگلا گھر تختے پر رکھ دیا تھا، پھر دوسرا گھر۔

خدا معلوم نکّے کو کیا ہوا تھا۔ یک دم اس کے سارے جسم میں تازہ گرم گرم لہو کا سیلاب آ گیا تھا۔ اس کے کان سرخ ہو گئے اور دماغ بے طرح بجنے لگا تھا۔ وہ بھاگا بھاگا گھر میں گیا تھا اور بابا کی دونالی بندوق اُتار کے اس میں کارتوس بھرے تھے۔ اس جنون میں بھاگتا ہوا باہر آ گیا تھا اور کاندھے پر بندوق رکھ کر نشانہ باندھا تھا۔

اس نے کھلی آنکھ سے دیکھا۔ بچھڑا ٹرک سے باہر گائے کے گرائے ہوئے پٹھوں میں منہ مار رہا تھا۔ ٹرک میں بندھی گائے باہر منہ نکال کر بچھڑے کو دیکھ رہی تھی۔ ان میں سے ایک گائے کو لے جانے کے لیے ٹرک میں بیٹھا تھا اور بابا ایک ہاتھ سے اپنی داڑھی میں عقل کو سہلاتا ہوا باہر کھڑے ڈرائیور سے ہاتھ ملا رہا تھا۔

پھر مجھے پتہ نہیں کیا ہوا۔ نکّے نے کسے نشانہ بنایا۔ گائے کو، بچھڑے کو، ڈرائیور کو، اپنے آپ کو، یا وہ ابھی تک نشانہ باندھے کھڑا ہے۔

کوئی وہاں جا کے دیکھے اور آ کے مجھے بتائے کہ پھر کیا ہوا۔ مجھے تو صرف اتنا پتہ ہے کہ ایک روز انہوں نے مل کر فیصلہ کیا تھا کہ۔ □□

انور قمر

انور قمر مہاراشٹر کے ناسک شہر میں ۵؍ فروری ۱۹۴۱ء کو پیدا ہوئے۔ میٹرک تک تعلیم حاصل کی۔ پہلا افسانہ ''نروان'' ۱۹۷۱ء میں ماہنامہ ''تحریک'' میں شائع ہوا۔ ان کے تین افسانوی مجموعے ''چاندنی کے سپرد''، ''چوپال میں سنا ہوا قصہ'' اور ''کلر بلائنڈ'' شائع ہو چکے ہیں۔ ''چوراہے پر ننگا آدمی'' ان کے موضوعی تناؤ اور فنی برتاؤ کا آئینہ دار ہے۔ اپنے فکشن کے گاڑھے تنقیدی شعور کے باعث بھی پہچانے جاتے ہیں۔ ''چوراہے پر ننگا آدمی'' پہلی بار ''نشانات'' اکتوبر ۱۹۷۵ء میں شائع ہوا۔

چوراہے پر ٹنگا آدمی

انور قمر

اُس کے دونوں ہاتھ پشت پر بندھے تھے اور پیر ٹخنوں سے --- گلے میں رسّی کا پھندا پڑا تھا اور وہ چوراہے پر جھول رہا تھا۔ اس کے جسم پر موجود لباس سے ظاہر ہوتا تھا کہ متوسط طبقے سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کی ٹیری کاٹ کی سفید قمیص اور ٹیری وول کی سلیٹی رنگ کی پتلون غیر شکن آلودہ تھی۔ سیاہ جوتے پر پالش بھی خوب چمک رہا تھا۔ نائلون کے ذرا سے نظر آتے موزوں کا الاسٹک بھی کسا ہوا تھا۔ اس لیے موزے اپنی جگہ پر چست بیٹھے تھے۔ اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ پہننے اوڑھنے کے معاملے میں بڑا محتاط شخص ہے۔

اس کے پیچھے کو بندھے داہنے ہاتھ میں اٹیچی لٹک رہی تھی، جو کھل چکی تھی۔ اس میں بنے خانوں میں ایک

بال پین ٹنگا ہوا تھا۔ دوسرے سے ایک ڈائری کا اوپری سرا جھانک رہا تھا۔

جب بحیرۂ عرب کی طرف سے ہوا کا کوئی جھونکا آتا تھا تو اس کی پیشانی پر بکھرے ہوئے بال پیچھے کو اُڑنے لگتے۔ کھلی ہوئی اٹیچی میں سے بھی اِکّادُکّا کاغذ اُڑ پڑتے اور وہ اس رسّی پر ٹنگا ٹنگا اِدھر اُدھر جھول جاتا۔ جھولنے کے عمل کے دوران میں ہر مرتبہ اس کی سیاہ فریم والی عینک ناک سے ذرا نیچے کھسک آتی اور اب ہر لمحہ کی ٹک پر اس کی ناک سے گر پڑنے والی تھی۔

چرچ گیٹ اسٹیشن کے حلق سے اُگلے ہوئے تمام لوگ اس کے داہنی طرف جمع تھے۔ مرین ڈرائیو کی طرف سے آنے والے اس کے سامنے کی طرف جمع تھے اور اس کی بائیں طرف وہ لوگ جمع تھے جو اِدھر اُدھر درمیانی سمتوں سے چلے آئے تھے۔

یوں محسوس ہوتا تھا کہ جیسے کوئی بہت بڑا لیڈر، کوئی مہاپرش، کوئی مہاتما یا کوئی پیغمبر اُن سے خطاب کرنے والا ہو اور وہ سب کے سب بڑی عقیدت سے اس کا خطبہ سُننے چلے آئے ہوں۔

وہ سب کے سب ایک دوسرے کی صعوبتوں سے واقف تھے۔ ان سبھوں کو معلوم تھا کہ انہیں کپڑے کیوں ڈستے ہیں، جوتے کیوں کاٹتے ہیں، کھانا کیوں بدمزہ لگتا ہے اور پانی کیوں نمکین لگتا ہے۔

دلچسپ بات تو یہ تھی کہ موجود ہر شخص چوراہے پر جھولتے اس شخص کو اپنی شبیہ وہاں پر سمجھ رہا تھا۔ ہر شخص یہ محسوس کر رہا تھا کہ وہ خود چوراہے پر لٹک رہا ہے۔

اسٹیشن کے پورٹیکو کے اوپر نصب گھڑی نے دس بجائے۔

نیلکو کی سکنڈ، منٹ اور گھنٹہ میں وقت بتاتی گھڑی نے دس بجائے۔

یونیورسٹی ٹاور کے کلاک نے دس بجائے۔ اور تمام لوگوں کی رسٹ واچوں نے دس بجائے۔ لیکن آج جو دس بجے تھے وہ کل کے سے نہیں اور ممکن ہے کہ آئندہ کل کے سے بھی نہ ہوں کیوں کہ ان تمام لوگوں کو اس وقت اپنی اپنی آفسوں میں اپنے اپنے ٹیبلوں کے پیچھے اپنی اپنی کرسیوں پر موجود ہونا تھا۔ لیکن یہ سب کے سب آج اس چوراہے پر ٹنگے اس آدمی کے گرد جمع تھے۔

سب کے سب خاموش! سب کے سب موشن لیس، غیر متحرک۔ ان کی تو آنکھیں بھی

مجسموں کی آنکھوں کی طرح پتھرائی ہوئی تھیں۔ اور دل؟ وہ بھی دھڑکنا بھول گیا تھا۔

"کچھ کہو...... کچھ کہو۔"

وہ سب کے سب یک زبان ہو کر بولے۔

"میں کیا کہوں؟ میں کیا کہوں؟ میرے گلے میں پھندا پڑا ہے۔ ہاتھ پشت پر بندھے ہیں! اور پیر حرکت کرنے سے معذور! میں تو اشاروں سے بھی بات نہیں کر سکتا۔ اور نہ یہاں سے کسی دوسری جگہ منتقل ہو سکتا ہوں۔"

"تم کہاں جانا چاہتے ہو؟ تم کہاں جانا چاہتے ہو؟" ان سبھوں نے اس چوراہے پر لٹکے آدمی سے پوچھا۔

"تم ہی بتاؤ، تم سب کہاں جانا چاہتے ہو؟"

اُس نے وہی سوال اُن سے کر دیا۔

"ہم کہاں جانا چاہتے ہیں؟...... ہم کہاں جانا چاہتے ہیں؟" وہ سب ایک دوسرے سے دریافت کرنے لگے۔

چوراہے پر ٹنگے آدمی نے قہقہہ لگایا۔ "ہا---ہا--- ہا، جب تمہیں خود ہی نہیں معلوم۔ اور تم سبھوں کو نہیں معلوم کہ تم کہاں جانا چاہتے ہو، تو یہ سوال تم نے مجھ سے کیوں کیا؟ اپنے آپ ہی سے پہلے پوچھ لیتے!"

"تم مہان ہو!" وہ سب بولے۔

"اس لیے کہ چوراہے پر لٹک رہا ہوں؟"

"نہیں تم وہاں کھڑے ہو جہاں سے ہم سب نظر آرہے ہیں اور ہم وہاں کھڑے ہیں جہاں سے ہمیں کچھ بھی نظر نہیں آرہا ہے۔"

"ہر بلندی سے نیچے کی چیز نظر نہیں آتی۔ اُونچائی اتنی ہی ہو کہ جہاں سے سب کچھ نظر آسکے۔"

"تو کیا تم بہت اُونچائی پر لٹک رہے ہو؟" ان سبھوں نے کہا۔

"ہاں۔"

"کیا تمہیں ہم نظر نہیں آرہے ہیں؟"

"مجھے تمہارے سروں کا کالا سمندر نظر آرہا ہے۔اور کچھ نہیں!"

"تو کیا تم کچھ نیچے نہیں آسکتے؟"

چوراہے پر ٹنگے اُس آدمی نے پھر قہقہہ لگایا۔

"ہا---ہا---ہا، تم جانتے ہو کہ میرے گلے میں پھندا پڑا ہے۔ میرے دونوں ہاتھ پشت پر بندھے ہیں۔ میرے پیر بھی حرکت کرنے سے معذور ہیں۔ تم ہی بتاؤ کہ میں اپنی جگہ سے کیسے جنبش کروں...... البتہ تم چاہو تو مجھے نیچے اُتار سکتے ہو۔ تم چاہو تو مجھے کم بلندی پر ٹانگ سکتے ہو۔اور تم چاہو تو مجھے اور زیادہ بلندی پر بھی اٹھا سکتے ہو!"

"ہم تمہیں نیچے اتارنا چاہتے ہیں۔" ان سبھوں نے کہا۔

"میں تیار ہوں۔"

"ہم تمہیں مناسب اونچائی پر ٹانگنا چاہتے ہیں۔"

"مجھے منظور ہے۔"

"ہم تمہیں بہت زیادہ اُونچائی پر اٹھا دینا چاہتے ہیں۔"

"مجھے یہ بھی منظور ہے۔" چوراہے پر لٹکے ہوئے آدمی نے کہا۔

"یہ کیا بات ہے کہ تم تینوں حالتوں میں رہنے کو تیار ہو۔" انھوں نے پوچھا۔

"اس لیے کہ میں ان تینوں حالتوں میں تم سبھوں سے الگ رہوں گا۔اس لیے خوش رہوں گا۔ بہت زیادہ اُونچائی پر بھی۔کم اُونچائی پر بھی---اور زمین پر بھی۔"

"وہ کیسے؟ زمین پر تم ہم سے الگ کیسے رہ سکتے ہو؟"

چوراہے پر ٹنگے آدمی نے پھر قہقہہ لگایا۔

"ہا---ہا---ہا، اب میں کبھی صبح اخبار نہیں پڑھوں گا۔ کبھی چائے نہیں پیوں گا۔ کبھی بوٹ پالش نہیں کراؤں گا۔ کبھی داڑھی نہیں بناؤں گا--- کبھی ریڈیو نہیں سنوں گا--- کبھی کام پر نہیں جاؤں گا۔ کبھی راہ چلتے اشتہار نہیں پڑھوں گا۔کبھی کسی کو 'تھینک یو' نہیں کہوں گا--- کیونکہ میں اپنی زندگی کے پہیے کو گھماتے گھماتے بور ہو گیا ہوں، بے زار ہو گیا ہوں۔ تھک گیا ہوں۔ وہ پہیا جس محور پر گھوم رہا ہے وہ اپنی جگہ ہی پر قائم ہے۔جب محور اپنی جگہ سے حرکت

نہیں کرتا تو پہیا کیوں حرکت کرے گا۔ میں وہیں ہوں جہاں تھا۔ اور اگر محور اب بھی نہ بدلو تو سالہاسال تک وہیں رہوں گا۔ اس لیے اب محور ہی کوئی اور ہوگا۔ نیا---انوکھا---اچھوتا!"

دو آدمی دائیں طرف کے درخت پر چڑھ گئے۔ اور دو بائیں طرف کے درخت پر! آناً فاناً انھوں نے رسّے کی گرہیں کھولیں اور بڑی آہستگی سے رسہ چھوڑتے ہوئے اس آدمی کو نیچے اتارا۔

اُس آدمی نے زمین پر قدم رکھتے ہی بڑی اجنبیت سے اُس جمِّ غفیر کو دیکھا۔ ابھی کچھ دیر پہلے ان تمام کا اس سے جو اجنبی سا رشتہ قائم ہوا تھا۔ وہ اس کی اجنبی نظروں نے توڑ دیا تھا۔ اس کے باوجود وہ اس کی طرف بڑی گرم جوشی سے بڑھے تاکہ اُسے گلے لگالیں، اور پوچھیں کہ اب اس کا نیا محور کون سا ہوگا؟ کیونکہ وہ سب کے سب اپنی زندگی کے پہیے کو ایک ہی غیر متحرک محور پر گھماتے گھماتے بور ہو گئے تھے، بےزار ہو گئے تھے--- تھک گئے تھے---اور اس نے وہ جو تازگی، فرحت اور کشادگی کی بات کہی تھی، انہیں بہت پسند آئی تھی۔

اس نے سب سے پہلے تو اِدھر اُدھر نظر دوڑائی۔ اس کے بیگ کے تمام کاغذات دُور دُور تک بکھرے پڑے تھے۔ اس نے انہیں جمع کیا۔ بیگ میں رکھا اور بیگ بند کر دیا۔ جیب سے کنگھی نکالی۔ بال بنائے۔ چشمہ ناک پر دُرست کیا اور رومال سے منہ صاف کیا۔ پھر آہتہ آہتہ ایک سمت کو چل پڑا---وہ سب کے سب اس کے پیچھے چل پڑے۔

وہ ایک بلند و بالا عمارت کے سامنے جا کر رُک گیا۔ عمارت کا داخلی دروازہ مقفل تھا۔

وہ بڑبڑانے لگا---"کیا آج چھٹی ہے؟"

"کیا آج میں گھر سے جلدی چلا ہوں؟"

"کیا آج کہیں کوئی ہنگامہ تو نہیں ہوا؟"

دوسرے روز حسبِ معمول اس نے اپنے چائے کے پہلے پیالے کے ساتھ اخبار دیکھا اور یہ خبر پڑھ کر ششدر رہ گیا کہ کل فلورا فاؤنٹن کے چوراہے پر ایک شخص نے اپنے گلے میں رسّی کا پھندا ڈال کر خودکشی کر لی۔ جس کی لاش دیکھنے کے لیے ہزاروں لوگ جمع ہو گئے تھے۔ اور وہ لوگ اس وقت تک جمع تھے جب تک چوراہے پر ٹنگے اس شخص کی لاش نیچے اتاری گئی۔ □□

بانو قدسیہ

پیدائش ۲۸ر نومبر ۱۹۲۹ء، فیروز پور (ہندوستان)۔ اپنے شوہر اشفاق احمد کے ساتھ ایک طویل مدت تک ادبی رسالے ''داستان گو'' کی ادارت میں شامل رہیں۔ فی الحال بچوں کے کومپلیکس کی ایگزیکیٹو ممبر ہیں۔ ان کے متعدد افسانوی مجموعوں میں ''امر بیل''، ''آتش زیرپا''، ''بازگشت'' اور ناولوں میں ''راجہ گدھ'' شامل ہیں۔ ایک ''امپریشن'' بھی ''مرد ابریشم'' کے نام سے لکھا۔ انہوں نے ٹی وی اور اسٹیج کے لیے بھی بہت سے ڈرامے لکھے ہیں۔ ان کے ادبی اور ثقافتی کارناموں پر انہیں کئی ایوارڈ مل چکے ہیں، مثلاً ''نیشنل ایوارڈ''، ''گریجویٹ ایوارڈ''، ''تاج ایوارڈ'' اور ''تمغۂ امتیاز''۔ آپ بہت سے ملکوں کی سیاحت بھی کر چکی ہیں۔

بیٹے کا خط

بانو قدسیہ

یہ ضیاء الحق کے دور کی بات نہیں۔

یہ بے نظیر کے دورِ حکومت کا بھی ذکر نہیں۔

نواز شریف کے وقت بھی ایسے نہیں ہوا۔

اندازہ ہے کہ صدام حسین کے کویت میں داخلے سے کچھ ہی دیر بعد یہ واقعہ ہوا ہوگا۔

گرمیوں کے دن تھے۔ ٹھنڈے کمرے میں ڈھلے فرش پر چارپائی ڈالے حاکم علی فل اسپیڈ پنکھے میں آنند سے لیٹا تھا۔ وہ اخبار میں امریکہ کی دھمکیاں اور صدام حسین کی خبریں پڑھ رہا تھا جب ڈاکیے نے گھنٹی بجائی۔ حاکم علی نے سمجھا کہ اس کا ٹائم میگزین، نیوز ویک یا پھر سائیکلو جی ٹوڈے ایسا کوئی رسالہ آیا ہوگا۔ وہ دھوتی سنبھالتا جلدی سے باہر

بر آمدے میں پہنچا تو ڈاکیہ کویت کا ایرَ لیٹر بر آمدے میں پھینک پھاٹک کر جا چکا تھا۔

کچھ دیر سے حاکم علی کو اس خط کا بڑا ہی انتظار تھا۔ اس کا اکلوتا بیٹا مقیم علی اپنی بیوی بچوں سمیت پچھلے بارہ سالوں سے کویت میں رہتا تھا اور کبھی کبھی اسے خط لکھنے میں بہت ہی دیر ہو جاتی تھی۔ حاکم علی نے بڑی احتیاط کے ساتھ پیپر کٹر سے ایرَ لیٹر کھولا۔ پڑھنے سے پہلے اسے آنکھوں سے لگایا اور پڑھنے کے بعد اسے سرہانے تلے رکھ دیا۔ اس خط نے اس کی ساری قوت چھین لی۔ وہ سوچنے لگا کہ موڑ پر جا کر ڈاکٹر جاوید سے بلڈ پریشر چیک کرانا چاہیے۔ پھر خیال آیا کہ دُکان سے گلوکوز خرید لاؤں اور وہ ہی پیتا رہوں تو شاید قدم زمین پکڑنے لگیں۔

اس سے پہلے جب بھی مقیم علی کا خط آیا، حاکم علی خط کو تھوڑے تھوڑے وقفوں کے بعد پڑھتا رہتا۔ کسی نوگرفتارِ عشق کی طرح ہر مرتبہ خط پڑھنے کے بعد بیٹے کے لیے اشتیاق بڑھ جاتا۔ خط کوئی جیون بوٹی، ٹانک، طاقت کا ٹیکہ، اُمنگ حوصلہ، نئی اسکیم کی مانند تھا کہ حاکم علی از سر نوجوان ہو جاتا۔ شیو بنانے سے پہلے، نہانے کے بعد، کھانا کھاتے ہی سرہانے پر کہنی ٹیک کر، ایک جوتا پہننے کے بعد، دوائی نگلتے وقت، سودے کا تھیلا بازو پر لٹکائے آدھی سیڑھیاں اُترتے ہوئے، قصائی کی دُکان پر کھڑے کھڑے، عشاء کی نماز سے کچھ پہلے اور ذرا سی دیر بعد نیند کا غلبہ بھانپتے ہی وہ جیب سے خط نکالتا اور پڑھتا۔ دن میں کئی بار خط سینت سینت کر رکھتا اور بھول بھول کر تلاش کرتا۔ اس آنکھ مچولی میں اس کے کئی دن بڑی راحت سے نکل جاتے اور اسے محسوس بھی نہ ہوتا کہ علامہ اقبال ٹاؤن کی اس چھوٹی سی کوٹھی میں وہ بالکل تنہا رہتا ہے۔ جب خط کا ایک ایک لفظ اور لفظوں کے پیچھے چھپے ہوئے واقعات، احساسات، ارادے، تخیل اسے حفظ ہو جاتے تو وہ نئے خط کے انتظار میں ڈاکیے کی راہ دیکھنے لگتا--- لیکن آخری خط نے تو جیسے اس کی کمر ہی توڑ دی...... اب نہ تو وہ زندوں میں تھا نہ زندہ رہ سکتا تھا!

حاکم علی نے ساری عمر افسری کی، ہمیشہ دفتری لباس پینٹ کوٹ ہی رکھا۔ اس وقت بھی جب بھٹو کے زمانے میں سرکاری افسروں نے قومی لباس اپنایا، اس نے اپنے لباس میں تبدیلی نہ کی۔ جنرل ضیاء الحق کے زمانے میں وہ ریٹائر ہو کر لاہور آ گیا۔ اسلام آباد میں وہ

سرکاری بنگلے میں رہتا تھا۔ لیکن ریٹائر ہوتے ہی سرکاری کوٹھی، پی اے، ٹیلی فون، ٹی اے ڈی اے، ان گنت میٹنگیں، سرکاری ڈنر، فائل بازی، پروموشن کے لیے انٹریگ اور اسلام آباد میں بسنے والے سرکاری دوست سب چھوٹ گئے۔ اتنی لمبی سروس میں اس نے صرف دو قیمتی چیزیں بنائی تھیں بیٹے مقیم علی کا کیریئر اور علامہ اقبال ٹاؤن میں دس مرلے کی کوٹھی۔ مقیم علی کو پہلے اس نے لاہور میں پڑھایا پھر بیرونِ ملک تعلیم دلوائی اور اب وہ کویت میں بارہ سال سے تیل کی کمپنی میں انجینئر تھا۔

جب حاکم علی اس دس مرلہ کی کوٹھی میں پہنچا تو دوست احباب اسلام آباد میں رہ گئے۔ بیوی کو مرے چار سال کا وقفہ ہو گیا تھا، رشتہ داریاں، رسم و رواج، لوک ریت جانے والی ساتھ لے گئی۔ اب وہ اس تین بیڈ روم کی کوٹھی میں اکیلا رہتا۔ خود ہی سودا لاتا۔ اپنی چھوٹی سی گاڑی کے لیے کوئی ڈرائیور نہ تھا جو تھوڑے بہت ان ڈور پلانٹ تھے انہیں بھی پانی خود ہی دینا پڑتا۔ سارا دن اخبار پڑھنے، اونگھنے، بیرونی ممالک سے آنے والے ٹائم میگزین، نیوز ویک، سائیکلوجی ٹوڈے اور اسی قسم کے رسالوں کی ورق گردانی میں گزرتا۔ لیکن چونکہ ان رسالوں کے متعلق کسی سے بات نہ ہوتی، اخباروں پر تبصرہ کرنے کے لیے ساتھ نہ ملتا اس لیے حاکم علی کو اب باتیں بھولنے لگی تھیں۔ پہلے تو وہ لوگوں کے نام بڑی مشکل سے یاد کر پاتا پھر ہولے ہولے تاریخیں اور دن گڈمڈ ہونے لگے۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ اپنی چابیاں، فونٹین پن، عینک بھی رکھ کر بھولنے لگا۔ ان چیزوں کو تلاش کرنے میں عام طور پر سیداں اس کی مدد کرتی۔

سیداں کوٹھے پنڈ سے بس پر سوار ہو کر حاکم علی کی کوٹھی پہنچتی تھی۔ اس کا رنگ گہرا سانولا، جسم بھاری اور دانت بہت چمکیلے تھے، جب وہ ہنستی تو کانوں تک ہنستی معلوم ہوتی۔ سیداں کے پاس گہرے نارنجی، کاسنی اور پیلے کپڑے تھے۔ ایسے گہرے رنگوں میں اس کا کتھا ملا رنگ اور بھی آبنوسی لگتا۔ جب پہلے پہل وہ کام کی تلاش میں آئی تو اس کے ساتھ دو بچے تھے ایک قریب قریب ننگا اس کے کولھے پر تھا اور ایک چھوٹی سی سیاہ لڑکی سنہری بالوں کا چھتہ کھجلتی اس کے گھٹنے سے لگی تھی۔ حاکم علی کو ان تینوں سے بڑی گھن آئی۔ وہ ایک عرصہ سے

اسلام آباد کے صاف ستھرے ماحول کا عادی ہو چکا تھا۔

"یہ بچے ساتھ لاؤ گی تو کام کیسے ہو گا؟"

"لو جی یہ کیوں ساتھ لاؤں گی۔ یہ تو میری ساس کے پاس رہیں گے۔ وہ بھی مشٹنڈی سارا دن حقہ پیتی نہیں تھکتی۔ ان کو سنبھالے گی تو سُرت ٹھکانے آجائے گی۔"

"کھانا پکا لو گی---"

"لو جی میں نے جج صاحب کی کوٹھی میں دس سال کام کیا ہے۔ وہ کراچی نہ چلے جاتے تو مجھے کوئی نوکری کی پروا پڑی تھی۔ مٹن چاپ پلاؤ--- کوفتے سب پکا لیتی ہوں، چائنی کھانے کا بھی محاورہ ہے جناب جی آپ پکوا کر دیکھ لیں---"

"اور تمہارا خاوند کیا کرتا ہے---"

"کئی سال سے لاپتہ ہے صاب جی--- ایک دوسری عورت کے ساتھ بھاگ گیا۔ طلاق دے گیا تھا جی۔"

"اچھا---"

"بے شرم کو زنانیوں کا بہت شوق تھا جی---"

ساتھ ہی وہ رونے لگی--- پہلے اس نے دوپٹے سے آنسو پونچھے پھر شڑاپ سے ناک صاف کر کے گیٹ کے ساتھ ہاتھ صاف کر لیا۔

حاکم علی کبھی سیداں کو ملازم نہ رکھتا لیکن جب سے وہ لاہور پہنچا تھا اسے نوکر کی بڑی تکلیف تھی۔ پھر حاکم علی کو یہ بھی احساس ہوا کہ سیداں ضرورت مند ہے۔ جلدی سے کام چھوڑ کر بھاگے گی نہیں۔ سیداں بظاہر گندی تھی لیکن باورچی خانے میں صفائی سے کام کرنے لگی۔ ایک بجے تک سارا کام کر کے اسے جانے کی جلدی ہوتی۔

"کھانا کھا لو--- صاب جی۔"

"ذرا آدھ گھنٹہ صبر کر لو سیداں---"

وہ چوکھٹ کے ساتھ کندھا لگا کر جرح کے انداز میں کھڑی ہو جاتی۔

''میرے چھوٹے بچے ہیں جی۔ میری ساس بڈھی ہے زیادہ دیر بچے نہیں رکھ سکتی---''

''اچھا تھوڑی دیر بعد چپاتی پکا دینا میں کھالوں گا---''

''میں روٹیاں پکا کر رکھ جاؤں جی ہاٹ ڈبے میں --- ہیں بابا جی؟''

پتہ نہیں یہ سیداں کی وجہ تھی یا اس کا لباس ایسا ہو گیا تھا۔ ہو سکتا ہے وہ جس نرمی اور انتظار سے سودا سلف خرید تا وہی وجہ ہو لیکن اب ڈاکیے سے لے کر قصائی تک سب اسے بابا جی کہنے لگے تھے۔ اس کا جی کبھی کبھی چاہتا کہ وہ ہاتھ میں تسبیح بھی پکڑ لے لیکن پتہ نہیں کیوں اسے شرم سی آجاتی۔ داڑھی رکھنے کا خیال بھی کبھی آجاتا لیکن اتنی دیر تک افسری کی تھی کہ شیو کرنا اب ایک ثانوی عادت سی بن گئی تھی۔

اقبال ٹاؤن کی اس کوٹھی میں بابا حاکم علی کو کوئی تکلیف نہ تھی۔ مقیم علی کے خط اور ڈرافٹ قریب قریب باقاعدگی سے آتے۔ حاکم علی کو ان پیسوں کی ضرورت نہ تھی لیکن وہ انہیں اپنے اکاؤنٹ میں داخل کرواتا رہتا کیونکہ اس کا خیال تھا کہ اس طرح کچھ معقول رقم جمع ہو جائے گی۔ حاکم علی کو نہ کوئی تکلیف تھی نہ پریشانی--- صرف دن بہت لمبے ہو گئے تھے۔ اخبار سارا ختم ہو جاتا اور صبح کے دس بجتے۔ ٹیلی ویژن کے تمام پروگراموں کے بعد بھی اسے نیند نہ آتی۔ انجینئر بیٹے کے تینوں بچوں کی تصویریں بھی باقاعدگی سے آتی رہتیں اور اسے پتہ چلتا کہ کس کا قد کتنا بڑھ گیا ہے۔ جو بھی کویت سے آتا، حاکم علی کے لیے اس کی بہو جائے نماز، تسبیح، آبِ زمزم اور کھجوریں ضرور بھیجتی۔ پہلے پہل تو ان کی حاکم علی کو بڑی خوشی ہوئی۔ پھر ان سوغاتوں سے اس کا اٹیچی کیس بھر گیا۔ پہلے پہل تو وہ یہ تحفے بڑی مسرت سے اپنے رشتہ داروں کے پاس اندرونِ شہر لے جایا کرتا۔ لیکن آہستہ آہستہ اس نے اپنے رشتہ دار بھی چھوڑ دیے اور تحفے بھی وہ مسجد پہنچانے لگا۔ اچھرے والے چاچا جی سید مٹھے والی پھوپھی صغراں، بادامی باغ والی بڑی بہن اور ایسے ہی دور پار کے رشتے دار یہ تحفے وصول کر کے بجھ سے جاتے۔ اس کے تمام رشتے دار ابھی ترقی کی سیڑھی پر اوپر چڑھنے میں مشغول تھے۔ انہیں اپنے

بچوّں کے مستقبل کی فکر تھی۔ انہیں جائے نماز، تسبیح کھجوریں دیکھ کر لگتا جیسے وہ اَن کلچرڈ، رجعت پسند، غریب ہوں۔ یہ تحفے پا کر انہیں ہلکی سی شرمندگی محسوس ہوتی۔

آخری بار جب وہ اپنے چچازاد بھائی کے گھر گیا تو بسنت کا دن تھا۔ محلے کے آسمان پر پتنگوں کے رنگ ڈول رہے تھے۔ بھائی اصغر تیسری منزل کی چھت پر تھے۔ اِدھر اُدھر بچوّں نے پتنگ، ڈور کی چرخیاں، پُرانا ٹین بسنت کا سامان لوہے کی کرسیوں پر بے ترتیبی سے پھیلا رکھا تھا۔ جب کوئی پتنگ کٹتی ایک نوجوان لڑکا ٹین کو چھوٹے سے ڈنڈے سے پیٹنے لگتا۔ سارے میں ''بوکاٹا'' کی صدائیں بلند ہوتیں اور کئی گھروں سے بکرے بلانے کی آوازیں آنے لگتیں۔ بھائی اصغر چھوٹے سے تخت پوش پر بیٹھے مالٹے چھیل چھیل کر کھا رہے تھے۔ ان کی بیوی دنداسہ اور لپ سٹک لگائے، کسی ہوئی قمیص میں ملبوس مونگ پھلیاں چھیل کر کھا رہی تھی۔

حاکم علی کو معلوم نہ تھا کہ عام کمزور انسان خدا کو صرف اس وقت جانتا ہے جب اس کی خواہش کے سامنے کوئی روک آتی ہے۔ جب تک خواہشات پوری ہوتی رہیں خدا اور خدا کی باتیں دخل در معقولات معلوم ہوتی ہیں۔ مغرب کے لوگ اسی لیے شاید خدا کو کم یاد کرتے ہیں کیونکہ وہاں عام انسان کی حسّیات سے تعلق رکھنے والی خواہشات عام حالات میں پوری ہوتی ہی رہتی ہیں۔ اس وقت بھائی اصغر کی ساری جنت کوٹھے پر موجود تھی اور انہیں دستک دے کر خدا یاد دلانے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔

بابا حاکم علی نے اپنے تھیلے میں سے کردشیے سے بُنی ہوئی چائنا کی ٹوپی نکالی۔ پھر آبِ زمزم کی بوتل، بادام بھری کھجوریں اور ترکی جائے نماز کو بھائی اصغر کے پاس رکھ دیا۔ ان ساری چیزوں میں سے بھابھی نے صرف کھجوروں کے پیکٹ کو اُٹھایا اور کھجور نکال کر کھاتے ہوئے بولیں۔

''ہائے ہائے بھائی حاکم علی اس چندرے مقیم کو سارے کویت میں یہی سوغاتیں ملتی ہیں۔ اب تو زمانہ الیکٹرک گڈز کا ہے کوئی ٹوسٹر، فوڈ فیکٹری، استری ہی بھیج دیتا۔ تسبیح جائے نماز تو سب کے پاس ہوتا ہے۔ تین جوان لڑکیاں بیاہنے جوگی۔ کچھ خیال نہ آیا مقیم کو؟''

ترکی جائے نماز کے اُوپر مرجان کی تسبیح، تسبیح کے سہارے آدھی گری آدھی کھڑی پلاسٹک کی سفید بوتل میں آبِ زمزم، کچھ لڑھکی کچھ پڑی ٹوپی حاکم علی کا منہ تکتی رہیں۔ جب شام کے وقت وہ تیسری منزل سے اترے ان چیزوں کو کسی نے ہاتھ نہ لگایا تھا۔ جب وہ ساری سیڑھیاں اُترنے والے تھے تو حاکم علی نے مُڑ کر تخت پوش پر نظر ڈالی۔ ایک کوابڈی کے مغالطے میں بوتل کو چونچ سے ٹکور رہا تھا۔ اس دن کے بعد بابا حاکم علی نے اپنے رشتہ داروں سے ملنا چھوڑ دیا۔ ویسے بھی بیوی کے بعد اسے رشتے ناتے سنبھالنے کی ائکل نہ رہی تھی۔ اب جب کویت کی سوغاتوں سے اٹیچی بھر جاتا تو وہ کچھ جائے نماز اور تسبیحیں مسجد چھوڑ آتا۔ لیکن رشتہ داروں سے پہلے اس نے ایک اور کوشش بھی کی تھی۔

یہ ان دنوں کی بات ہے جب حاکم علی میں ریٹائرمنٹ کے باوجود تھوڑی بہت افسری موجود تھی۔ پھر بھی اس نے شلوار قمیص اور دھوتی میں گھر سے باہر نکلنا شروع کر دیا تھا۔ ان دنوں اس کا دوست قیصر اسلام آباد سے ریٹائر ہو کر لاہور آیا تھا۔ اس کی ایک کوٹھی شکر پڑیاں کی جانب تھی اور ایک پختہ دو منزلہ گھر سمن آباد میں تھا۔ ابھی حاکم علی کے دو تین دوست لاہور میں وقتاً فوقتاً اسے ملتے رہتے تھے۔ قیصر کے آنے پر حاکم علی کو احساس ہوا کہ گویا ایک مستقل ٹھکانہ مل گیا جہاں وہ قریباً سارے ہی دوستوں سے مل سکتا ہے۔

ایک شام جب شہر میں بڑے جلوس نکل رہے تھے وہ لمبے راستوں سے ہو کر قیصر کے گھر پہنچا۔ اس کے بریف کیس میں چار جائے نماز، کچھ خوبصورت جگمگاتی تسبیحیں، آبِ زمزم کی بوتلیں تھیں۔ قیصر کے گھر میں ایک لڑکا ٹیوب کے شرانوں سے چھوٹے برآمدے کو دھونے میں مشغول تھا۔

"بیٹا اندر اطلاع کر دو---"

بیٹے نے کوئی توجہ نہ دی۔ تخاطب نے بھی اسے نرم نہ کیا۔

تھوڑی دیر بریف کیس ہاتھ میں لیے کھڑے رہنے کے بعد پھر حاکم علی نے پوچھا۔

"کیوں بھئی قیصر صاحب موجود ہیں۔"

لڑکے نے کچھ ایسے ٹیوب کا شراٹا چلایا کہ کچھ چھینٹے حاکم علی کی شلوار قمیص پر بھی پڑ گئے۔
"ہاں جی برج کھیل رہے ہیں۔ بابا جی آپ اپنا نام بتا دیں---"
لمحہ بھر کو حاکم علی نے مڑ کر اپنی فوکس کار کی طرف دیکھا۔ وہ بابا جی کو کار میں تلاش کرنے لگا۔ جب لڑکا آرام سے پودوں کو پانی دے کر اندر گیا تو حاکم علی کو خیال آیا کہ وہ واپس چلا جائے لیکن اسی وقت لڑکا آگیا۔ انتظار کی ذلت کا وہ عادی نہ تھا۔ لیکن بریف کیس نے اسے تقویت دی اور وہ اندر چلا گیا۔

چار مڈل ایج افسر صورت آدمی کمرے میں برج کھیل رہے تھے اور ایک چھوٹی سی بچی صوفے پر گھوک سوئی پڑی تھی۔
"آیئے آیئے سر آیئے، بڑے دنوں بعد خیال آیا آپ کو...... ویلکم...... ویلکم......"
قیصر نے اپنی کرسی چھوڑے بغیر بڑے تپاک سے کہا اور بچی کے پاس بیٹھنے کا اشارہ بھی کیا۔
"ابھی سر...... بس یہ بازی ختم ہو جائے پلیز سیٹ ڈاؤن۔"
حاکم علی نے بریف کیس صوفے کے پاس تپائی پر رکھا اور خود سوئی بچی کے پیروں والی سائیڈ پر بیٹھ گیا۔ برج کی بازی خوب پھنسی ہوئی تھی اور وہ چاروں بڑے انہماک سے کھیل میں مشغول تھے۔ وہ چپ چاپ صوفے پر بیٹھا رہا۔ دیوار پر لگی سرخ فریم والی گھڑی، ٹیلی ویژن پر پڑے ہوئے گلدان میں پلاسٹک کے پھول، مونالیزا کی تصویر کا ناقص پرنٹ، مٹی سے اٹا ٹیپ ریکارڈر، فرش پر پڑا ہوا وی سی آر...... چھوٹی بچی کے ڈھیلے سرخ ربن...... کئی بار حاکم علی نے کمرے کی کنسوئی لی۔ ارد گرد ایسی کوئی چیز موجود نہ تھی جو اس کے تحیر کا باعث بنتی۔
"اچھا قیصر میں چلتا ہوں...... پھر آؤں گا......"
"ناں...... ناں...... ناں جی ناں آپ نہیں جا سکتے ابھی چائے کا دور ہو گا۔ کرنل صاحب نے جیل روڈ سے چرغے منگوائے ہیں۔ میری وائف انتظام کر رہی ہے آپ سر بالکل نہیں جا سکتے آج تو ہم جشن منا رہے ہیں۔ کرنل صاحب کی محبوبہ امریکہ سے آرہی ہے، ۷۴۷ پی

کے پر...... بیس سال پرانی محبوبہ!

کرنل صاحب کا چقندر سا سُرخ چہرہ اور لال ہو گیا۔

حاکم علی کو اپنے اندر موت کا سا سناٹا محسوس ہوا...... یہ چاروں اس کے کچے پکے دوست تھے لیکن وہ ان میں سے کسی کے ساتھ بھی خود کو Relate نہیں کر سکتا۔ وہ جیسے کرکٹ کے کھیل کا بارہواں کھلاڑی تھا جو پانی کا گلاس، دستانے، بیٹ یا تولیہ لے کر اندر گراؤنڈ میں تو جا سکتا ہے لیکن گیم یا ٹیم کا حصہ نہیں بن سکتا۔ بڑی دیر تک وہ ان کھلاڑیوں کے قریب بیٹھا انہیں دیکھتا رہا۔

قیصر کے عین سامنے ریٹائرڈ پولیس آفیسر طاہر وحید بیٹھا تھا۔ اس پر حاکم علی کے چند دفتری احسانات تھے لیکن اِس وقت وہ پہلے سے بھی زیادہ احسان فراموش، دُنبے کی طرح پلا ہوا اور پولیس کا شکرالگ رہا تھا۔ چقندر سالال کرنل بہت اونچا قہقہہ لگا کر اتنی دیر تک ہنستا رہتا کہ ٹیلی ویژن پر پڑے نقلی پھولوں کا رنگ اور بھی فق ہو جاتا۔ کرنل چندھیائی آنکھوں، سفید بالوں اور تنگ پتلون کے باوجود جھرنے کی طرح زندگی سے بھرا تھا۔ کرنل صاحب کے سامنے اختر صاحب بیٹھے تھے۔ قیصر نے اپنی ٹیوٹا کرولا ان ہی کے شوروم پر رکھ کر بکوائی تھی۔ اختر صاحب کاروں کا بزنس کرتے تھے۔ ان کا شوروم سب سے بڑا تھا۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ اختر صاحب کے بیٹوں نے سارا بزنس ہتھیا کر انہیں شوروم میں آنے سے بھی منع کر دیا ہے۔ اور اسی لیے وہ قیصر صاحب کے گھر صبح صبح وارد ہو جاتے ہیں۔ اختر صاحب کا ری ایکشن ٹائم سب سے سُست تھا، وہ پتہ چننے پھینکنے، سر اٹھانے میں بڑی دیر لگاتے لیکن اس دوران وہ امریکہ کی کرسٹینا، لاہور کی گلنار بائی، کراچی کی بلیک بیوٹی، بیروت کی محاسن اور ایسے ہی کئی اور قصّے ایسی لپٹ سے سناتے کہ باقی تینوں کھلاڑی چسکے کے ساتھ سی سی کرنے لگتے۔

بڑی دیر تک برج کی بازیاں چلتی رہیں۔ حاکم علی دو تین بار اونگھ کر چوکنا ہو گیا۔ بچی جاگ کر اندر چلی گئی۔ اس دوران ان کھلاڑیوں نے جی بھر کر زمینوں، کوٹھیوں، عورتوں کی باتیں کیں۔ ان کا آپس میں کوئی پردہ نہ تھا۔ وہ چاروں عمر کے ایسے حصے میں پہنچ چکے تھے جب

ہر مزے دار چسکے کی چیز منع ہو جاتی ہے۔ انہیں اپنے اپنے ڈاکٹر نے گھی چینی اور کاربوہائیڈ ریٹ کھانے منع کر دیے تھے۔ اسی طرح عورت بھی ان کے لیے بلڈ پریشر، ہارٹ اٹیک، ٹینشن، فیملی بریک پوائنٹ کا باعث ہو سکتی تھی۔ منع کے باوجود ان کی ساری لذت جسم سے سمٹ کر ذہن میں گھس گئی تھی۔ اور اب وہ چاروں اللہ کے بنائے ہوئے اس کھلونے جسم سے ذہنی طور پر بہت محظوظ ہو رہے تھے۔ طاہر وحید کے پاس جنسی لطیفوں کی پوری ڈکشنری تھی۔ ہر بار جب وہ لطیفہ سناتے تو شوروم والے اختر صاحب کے ہاتھ سے پتے چھوٹ جاتے اور پھر وہ بڑی دیر تک اپنی گود، کرسی تلے اور پھول دار قالین سے پتے چننے میں صرف کرتے۔ جب عورت کا ٹاپک مندا پڑنے لگتا تو کرنل صاحب جوگنگ اور دوائیوں کا ٹاپک شروع کر دیتے۔ سیر کے لیے جو بھی لوازمات، شرائط اور اصول ضروری ہیں ان پر تبادلۂ خیال ہونے لگتا۔

یہ چاروں حرص، ایمبشن، احساسِ لذت اور جوش پر زندہ تھے۔ کافی دیر ہوئی حاکم علی نے سہاروں کے ساتھ جینا چھوڑ دیا تھا۔ پتہ نہیں کیسے اسے معلوم ہو گیا تھا کہ یہ سارے راستے بند گلیاں ہیں اور ان کے آخر میں کچھ نہیں ہے۔ حاکم علی ان کے پاس مکھی کی طرح ہاتھ ملتا بیٹھا رہا۔ پھر جب عشا کی اذان ہو گئی تو بریف کیس کھولتے ہوئے بولا۔

"وہ قیصر...... میں تم چاروں کے لیے یہ کچھ سوغاتیں لایا تھا---"

"ویری گڈ...... ویری گڈ...... بس یہ بازی ختم ہو جائے تو اسی پر ہم عشا کی نماز پڑھیں گے۔ مجھے تو واقعی اس کی بڑی ضرورت تھی---"

لیکن قیصر نے جائے نماز کی طرف دیکھنے کی بھی کوشش نہ کی۔

"وہ مقیم علی لاہور نہیں آتا۔ بس جائے نمازوں پر بڈھے کو ٹرخا دیتا ہے---" کرنل بولا۔ چاروں نے اُونچا قہقہہ لگایا۔

"آیا تھا پچھلے مہینے ہفتے کے لیے۔ اس کا کام ہی ایسا ہے ریفائنری میں انجینئر ہے، لمبی چھٹی نہیں ملتی۔"

"بہو آکر رونق لگاتی ہو گی بچوں سمیت......"

"ہاں...... آئی تھی مقیم کے ساتھ ...... بلکہ میں گیا تھا پچھلے دنوں کویت ......"

حاکم علی کو اچھی طرح یاد نہیں تھا کہ بہو سلیمہ آخری بار کب آئی تھی! اس نے لجاجت سے سوغاتیں صوفے پر رکھیں اور اٹھنے لگا تو قیصر نے آخری بار کہا--- "سر یہ آخری بازی ہے اس کے بعد ڈِنر ہے آپ رُک جائیں۔"

"نہیں بس میں جلد سونے کا عادی ہوں آپ مجھے معاف کریں---"

"چلیے میں آپ کو چھوڑ آؤں---"

"نہیں نہیں میں چلا جاؤں گا پلیز کیری آن......"

ان چاروں نے اَن مانے جی سے اپنی اپنی کرسی سے اِنچ بھر اوپر ہو کر اسے شب بخیر کہا اور وہ دروازے تک نہ پہنچا تھا کہ چھوٹی بچی دُودھ کی بوتل اٹھائے آئی اور سوغاتوں کے ڈھیر پر ٹانگیں رکھ کر دُودھ پینے میں مشغول ہو گئی۔ پتہ نہیں کیوں اس شام کے بعد حاکم علی اپنے دوستوں سے بھی بچھڑ گیا۔

اسی زمانے میں حاکم علی نے لباس بدلا۔ پرانی سوچ کو کھونٹی سے لٹکایا۔ خود سودا سلف لانے لگا۔ اب وہ عصر کے وقت مسجد چلا جاتا اور عشا کے بعد لوٹتا۔ کچھ اکونومکس اور پولیٹکس کی کتابیں ریڈنگ ڈیسک سے اٹھا کر اس نے وہاں دینی کتابیں سجالی تھیں۔ سونے سے پہلے وہ ٹیپ ریکارڈ پر کوئی قوالی سن کر رنجیدہ سا سو جاتا۔ اسے لگتا بھجن بن اس نے ساری ہیرا سی زندگی گنوادی ہے۔ لیکن ایک بات میں کبھی فرق نہ آیا۔

وہ ضیاء الحق کے زمانے میں بھی مقیم علی کے خط کا انتظار کرتا تھا۔

بے نظیر کے عہدِ حکومت میں بھی خطوں نے اس کی زندگی میں چاشنی بھر رکھی تھی۔

نواز شریف آیا تو بھی خطوں کا انتظار کم نہ ہوا۔

لیکن جب صدّام حسین نے کویت پر حملہ کیا تو ایسا خط ملا جس نے حاکم علی کے چھکّے چھڑا دیے۔ کبھی کبھی سیداں باورچی خانے سے اٹھ کر آتی اور چوکھٹ سے لیس دار ہاتھ پونچھتے ہوئے پوچھتی۔

''کیوں صاب جی خط آیا......؟''

''نہیں سیداں ہفتہ ہو گیا---''

''تو آپ خود پھر ہو آؤ کوئی روک ہے--- ٹکٹ لو، پوتے پوتیاں دیکھ آؤ---''

''مجھ سے اب سفر نہیں ہوتا سیداں--- ہوائی جہاز کی سیڑھیاں نہیں چڑھی جاتیں مجھ سے۔''

کالی سیداں نارنجی قمیص میں چمکیلے دانتوں سے ہنستی۔

''اب یہ تو ہو نہیں سکتا کہ آپ ارمان بھی کریں اور بچے بھی آپ کو مل جائیں--- ملنا تو جا کر ہی ہو سکتا ہے۔ بچوں کے لیے کھیچل تو کرنی ہی پڑتی ہے--- مجھ کو دیکھ لیں۔''

وہ چپ ہو جاتا۔ حاکم علی اَن پڑھ سیداں کو کیا بتاتا کہ کھیچل بغیر جذبے کے نہیں ہو سکتی اور اب تو تین سال سے اس نے ڈرائیور کو بھی چھٹی دے دی تھی اور خود بھی وہ بڑی مشکل سے ڈرائیو کرتا تھا۔ جب سے آنکھوں میں موتیا بند اُترنے لگا تھا روشنی کے چمکارے اسے بہت تنگ کرتے۔

جب تک ڈرائیور رہا اس کی بھی عجب مصیبت تھی۔ اسے چونکہ زیادہ کام کاج نہ تھا اس لیے وہ سوتا اونگھتا، کھاتا زیادہ تھا۔ اور ذرا بھی چار بجے کے بعد رُکنا پڑتا تو اوور ٹائم گننے اور جھگڑنے میں وقت گزارتا۔ پھر اس کی سیداں سے کبھی نہ بنی۔ کڑوی سی سیداں کی ساری گفتگو اس کی اپنی ذات کے گرد گھومتی تھی۔ ڈرائیور کی خواہش تھی کہ وہ اپنے مسائل سے نکل کر تھوڑی دیر کے لیے اس کی مشکلات کا بھی اندازہ لگائے۔ حاکم علی بڑی دیر تک یہ سوچتا رہا کہ ان دونوں میں سے کون زیادہ مفید ہے۔ بالآخر اس نے ڈرائیور کو چھٹی دے دی--- کیونکہ کار تو وہ پھر بھی ڈرائیو کر سکتا تھا۔ روٹی پکانا اس کے بس کی بات نہ تھی--- کار چلانے میں بھی اسے کئی دقتیں در پیش ہوئیں۔ ایک تو نظر روز بہ روز خراب ہو رہی تھی۔ پھر Reflexes پہلے جیسے تیز نہ تھے۔ رَش میں اوور ٹیک کرتے اسے خوف آتا۔ لیکن سب سے بڑی مشکل فقیر تھے۔ جونہی کوئی چوراہا آتا جھٹ کہیں نہ کہیں سے کوئی مانگنے والا لنگڑاتا ہوا

آجاتا۔ کسی فقیر کے بازو پر کاریں صاف کرنے والے نارنجی رومال ہوتے کچھ ٹنڈے بازو پھوڑے پھنسیوں سے لدے جسم کو جنس بنا کر بیچتے۔ کچھ بیوہ صورت عورتیں بچہ ہی رحم بنور نے کو پیش کر دیتیں۔ حاکم علی کو چوراہے سے خوف آنے لگتا۔ وہ خدا ترس آدمی تھا۔ لیکن اب اس کے رویے میں بڑی تبدیلی آگئی تھی۔ وہ فقیروں سے جھگڑتا، انہیں پیسے نہ دیتا اور جلد سے چوک پار کر جاتا۔

لیکن جب صدام حسین نے کویت پر حملہ کیا، اس سے کچھ ہی دیر پہلے حاکم علی کا رویہ بدل چکا تھا۔ جونہی کار چوک میں پہنچتی وہ شیشہ چڑھا لیتا اور پکا منہ کر کے سامنے والی بتی کو گھورنے لگتا۔ گو حاکم علی کو خود معلوم نہ ہو سکا لیکن اس بے اعتنائی کی صرف اتنی وجہ تھی کہ پہلے جب وہ فقیر کو پیسے دیا کرتا تھا تو فقیر لوگ دل دوز آواز میں اسے درازیِ عمر کی دعائیں دیتے۔ یہ دُعا موزر کی طرح اس کے سکون پر فائر کرتی۔ وہ سارا وقت سوچتا رہتا کہ آخر میں نے فقیر کا کیا بگاڑا ہے کہ یہ مجھے بددُعائیں دیتا ہے۔ مرنے کے بعد جیتے چلے جانے کے عذاب سے وہ خوب واقف تھا۔

اس عذاب سے کچھ دنوں کے لیے وہ نکل گیا --- سیداں اس کے لیے کھانا ٹرے میں لگا کر لائی تو وہ نقلی دانت دھو کر لگا رہا تھا۔

''صاب جی ایک بات کہوں؟ ---'' سیداں نے اپنے گھبرے کاسنی کپڑوں سے ہاتھ پونچھ کر کہا۔

''کہو۔''

وہ نیچی کرسی پر بیٹھ گیا --- کھانا کھانے کو اس کا جی نہیں چاہتا تھا۔ پتہ نہیں کیا وجہ تھی لیکن کئی ہفتوں سے اسے کھانا دیکھ کر اُبکائی سی آنے لگتی۔

''صاب جی آپ کویت جا کر بچوں سے مل آئیں ---''

''کیوں ابھی چھ مہینے تو ہوئے ہیں --- وہ آئے تھے ---''

''صاب جی...... جینے کے لیے کوئی بکھیڑا ضرور ہوتا ہے۔ کچھ دن آپ کو جانے کی

کھچپل پڑی رہے گی۔ پھر دو چار مہینے وہاں دل لگا رہے گا۔ بچے دوڑائی پھریں گے۔ پھر آنے کا بکھیڑا ہو گا۔ اس طرح آپ کی عمر تھوڑی گزرے ہے ...... آپ تو سارا دن یوں پڑے رہتے ہیں جیسے کوئی قبر میں سوتا ہے۔ کوئی مصیبت ہو مسئلہ ہو...... وقت شپاشپ گزر جائے۔"

اور حاکم علی نے ہفتے بعد ایک مستقل مسئلہ پال لیا۔ اس وقت حاکم علی کے وہم میں بھی نہیں تھا کہ کبھی مقیم علی کا ایسا خط بھی آ سکتا ہے! مقیم علی اور اس کا خاندان تو چھوٹی چھوٹی وزٹ پر پاکستان آیا کرتے تھے۔

صدر ضیاء کے عہد میں وہ صرف دو بار آیا۔

بے نظیر کے زمانے میں اس نے تین دن باپ کے ساتھ گزارے۔

نواز شریف نے جب عنانِ حکومت سنبھالی تو وہ چار بار آیا لیکن کبھی ایک رات سے زیادہ نہ ٹھہرا۔

لیکن صدام حسین نے جب کویت پر حملہ کیا تو مقیم علی نے واپس آنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس سے پہلے جب بھی حاکم علی کو اپنے بیٹے کا خط ملتا وہ اسے وقفے وقفے کے ساتھ پڑھتا آنکھوں سے لگاتا۔ خط اسے از سر نو زندگی بخشتا لیکن یہ خط تو واقعہ تھا، حادثہ تھا، اس کی موت تھا۔ اس نے خط کھول کر پھر پڑھنا چاہا لیکن اس کی نبض تیز چلنے لگی۔ جی میں آئی کہ ڈاکٹر جاوید کے پاس جا کر بلڈ پریشر چیک کرا لے۔ پھر اس نے خط کو سرہانے تلے رکھا اور سیداں کو آواز دی۔

"گلاس میں گلوکوز لے کر آ......"

سیداں بڑی دیر بعد گلوکوز کا گلاس لے کر بر آمد ہوئی۔

"ہائے ہائے اتنی اُونچی کیوں بول رہے ہیں۔"

"لے خط پڑھ لے...... لیکن تو کیا پڑھے گی......"

"ہاہاں دیں مجھے طعنہ اَن پڑھ ہونے کا---"

"مقیم علی آ رہا ہے--- بیوی بچوں سمیت......" حاکم علی نے کہا۔

"تو پھر کیا---میں دو چار دن رات کو گھر چلی جاؤں گی۔"

"بے وقوف...... وہ پکاّ آرہا ہے---صدّام حسین نے کویت پر حملہ کر دیا ہے۔غیر ملکی گھروں کو واپس آرہے ہیں پکےّ......"

سیداں کو صرف اتنی بات سمجھ آئی کہ مقیم علی اپنے گھر واپس آرہا ہے اور اسے اپنے گھر سے جانا پڑے گا۔وجہ تک وہ نہ پہنچ سکی۔بڑی دیر تک اس کے چمکیلے دانت منہ میں بند رہے۔

"تو پھر کونسا ایسا مسئلہ ہے آپ اسے سچ سچ بتا دینا کہ آپ نے میرے سے نکاح کر لیا ہے---ان کو تو کوئی پرواہی نہیں تھی کہ کیسے بڈّھے کو تنہائی کا روگ کھا گیا۔"

"کم بخت مسئلہ اتنا ہونا چاہیے کہ زندہ رکھ سکے---ایسا ہرگز نہیں ہونا چاہیے جو مار ہی ڈالے---"

سیداں کھی کھی کر کے ہنسنے لگی۔ابھی وہ جوان تھی اور بازو اوپر کر کے زندگی سے لڑ سکتی تھی۔حاکم علی نے سرہانے پر سر رکھ لیا۔سرہانے کے نیچے وہی خط تھا جس کا اسے کئی مہینوں سے انتظار تھا۔

حاکم علی سوچ رہا تھا کہ کیا کبھی بیٹے کا خط بھی اتنا سفاک ہو سکتا ہے؟ یہ چھوٹا سا خط تو ٹینکوں کی چڑھائی سے بھی بڑھ گیا تھا۔□□

جوگندر پال

پیدائش ۱۹۲۵ء بمقام سیالکوٹ (پاکستان)، تعلیم ایم۔اے۔ (انگریزی) کینیا کی وزارت تعلیم سے وابستہ رہنے کے بعد مہاراشٹر کے ایک پوسٹ گریجویٹ کالج میں پرنسپل رہے۔ افسانوی مجموعوں اور ناولوں میں سے چند ایک "کھلا" (افسانے)، "کھودو بابا کا مقبرہ" (افسانے)، "کتھا نگر" (افسانچے)، "خواب رو" (ناولٹ) اور "نادید" (ناول)۔ اکثر افسانوں اور ناولوں کے ترجمے ہندی اور انگریزی کے علاوہ دیگر ملکی اور غیر ملکی زبانوں میں ہو چکے ہیں اور متعدد رسائل ان کے فن اور زندگی پر اسپیشل فیچر اور خصوصی شمارے شائع کر چکے ہیں۔ ان ہی کے الفاظ میں: "میری اپنی کوئی پہچان نہیں ہے۔ میں جو کچھ دیکھتا ہوں وہی بن جاتا ہوں۔ یہی میری پہچان ہے۔"

کھوڈو بابا کا مقبرہ

جوگندر پال

کھوڈو بابا اور شام اس جھونپڑ پٹی میں آگے پیچھے داخل ہوئے۔ شام تو آپ ہی آپ سایہ سایہ آگے بڑھ گئی اور کھوڈو بابا کو دیکھ کر ایک پلا ہوا کتا گویا یہ کہنے کے لیے بھونکا کہ میرے پیچھے پیچھے آؤ اور اُس کے آگے آگے ہولیا اور چھوٹی چھوٹی جھونپڑیوں کے بیچوں بیچ تنگ راستوں سے گزر کر اُسے ایک نمایاں جھونپڑے کے دروازے پر لا کھڑا کیا۔ بابا نے شاید اپنے آپ سے کچھ کہنے یا جھونپڑے والے کو بُلانے کے لیے صدا لگائی ''حق!'' جس پر خفا ہو کر کتا بھونکنے لگا...... واہوں!--- واہو--- چودھری کو بُلانا، نہ بُلانا میرا کام ہے بابا!--- وہوں---!

''سن لیاں ہے، بندھوں، سُن لیاں ہے۔'' رکھا چودھری اپنی شلوار اُونچی کرتے ہوئے جھونپڑے سے باہر نکلا اور اُن کی طرف آتے آتے شلوار کے ازار بند میں ڈھیل محسوس کر کے اِسے کسنے کے لیے رُک گیا۔ ''کسے پکڑ لائے ہوں؟'' اُس کی ناک میں شاید چند فالتو سوراخ تھے، جن سے اُس کی آواز لیک ہو ہو کر جابجا نون میں بھر جاتی تھی ''ہر کسی کو باپ بناں کے لے آتے ہوں۔ میں کنس کنس کوں گھر دوں؟ بولوں!''

بندھو کتا بدک کر ذرا پیچھے ہٹ گیا اور کھوڈو بابا کی طرف سر اُٹھا کے غرایا۔ ''بولو!''

مگر بابا خاموش کھڑا رکھے چودھری کو گھُور تا رہا۔

''ایسے گھور کے کیوں دیکھ رہے ہوں، باباں؟'' چودھری گھبرا کر مونچھوں کو تاؤ دینے لگا ''میں کوئی اور نہیں، میں ہی ہوں۔''

''نہیں، کھوڈو۔'' کھوڈو بابا نے اپنی گھنی داڑھی میں سے منہ کھولا۔ ''کھوڈو کو کیا معلوم، کھوڈو کون ہے؟''

چودھری کو غصہ آنے لگا۔ ''میرا نام کھوڈوں نہیں، باباں۔''

چودھری ابھی اپنا غصہ اُتار بھی نہ پایا تھا کہ بابا نے پھر اچانک صدا لگائی ''حق!'' اور ایک پتھر اُٹھا کر اُس کے پیروں کی طرف دے مارا۔

''ار۔رے!'' چودھری پیچھے اُچھل گیا اور پھر اپنے سامنے ایک کچلے ہوئے بچھو پر نظر پڑنے پر کھڑا رہ گیا---''باپ رے!'' جسے وہ کوئی گداگر سمجھ رہا تھا وہی اب اُسے کوئی ولی دِکھنے لگا۔ ''جھگی چاہیے، باباں؟ ضرور دوں گا۔ اوروں سے سنگل جھگی کی زمین کے پورے پنج اوپر پنج سینکڑے، پر تم پنج اوپر دون سینکڑے بھی دے دوں تو چلے گاں۔''

''میرے ہاتھوں ناحق ایک خون ہو گیا کھوڈو۔'' بابا کو اطمینان بھی تھا کہ چودھری کا بچاؤ ہو گیا ہے اور افسوس بھی، کہ بچھو کچلا گیا ہے۔

''میراں نام۔'' چودھری نے بابا کو بتانا چاہا کہ اس کا نام کھوڈو نہیں ہے۔ مگر اس نے خود کو روک لیا۔ ''بچھوں کوں مارنے کا دُکھ کاہے کاں، باباں؟ جوں کاٹتاں ہے اُسے مارنا ہی اچھا ہے۔''

"بچھو بھی کہتے ہیں، جو مارتا ہے اُسے کاٹنا ہی اچھا ہے۔"

اسی اثنا میں بندھو کو نہ جانے کیا سوجھی کہ وہ بابا کے پیروں پر لوٹنے لگا۔

"ارے بھاگوں، کتے کی اولاد۔" رکھا چودھری ایک ہاتھ اوپر کر کے اُس کی طرف بڑھا۔ "جاؤں، اپنی چوکیداری کروں۔"

مگر کھوڈو بابا نے جھک کر پیار سے کتے کی پیٹھ تھپتھپائی، اور اپنا سر اوپر اُٹھانے سے پہلے زمین سے مٹی کی مٹھی بھر کر اپنے سر میں ڈال لی۔

رکھا چودھری پہلے تو اُسے حیرت سے دیکھتا رہا، اور پھر یہ خیال آنے پر اُس نے عقیدت سے اپنے دونوں ہاتھ سینے پر باندھ لیے کہ یہ تو واقعی کوئی کرامتی بابا ہے--- "باباں، تم کہاں نیچ اوپر دون سینکڑوں کا بوجھ اٹھائے پھرتے ہوں گے؟ پر کوئی بانت نہیں۔" وہ پھر اپنا ازار بند کسنے لگا۔ "اندر آؤں اور مجھ سے یہ سارے پیسے وصول کر کے میرے ہی ہاتھ میں تھمادوں۔" وہ کھی کھی ہنس رہا تھا۔ "بانت یہ ہے کہ چودھری مفت میں جان دے دے توں دے دے، پر جھگی نہیں دیتاں--- آؤں، باباں، اندر آں کے براجوں۔"

چودھری بدستور بندھے ہاتھوں اپنے دروازے کی طرف مڑ کر بندھو کے مانند دُم نکالے کھوڈو بابا کے آگے آگے ہولیا، اور کھوڈو بابا اُس کے پیچھے پیچھے، اور ان کی پشت پر بندھو اپنی پچھلی ٹانگوں پر کھڑے ہو کر اگلی کو اپنے مالک کے مانند سینے پر باندھنے کا جتن کر رہا تھا اور اپنی کوشش میں ناکام ہونے پر گلے سے کچھ ایسی یک حرفی بھونک پیدا کرتا تھا جیسے 'حق' کی صدا لگا رہا ہو۔

جھونپڑے کے اندر پہنچ کر رکھے چودھری نے اپنے ہاتھوں کشید کی ہوئی شراب سے بابا کی تواضع کرنا چاہی۔ اُس نے سوچا کہ پہنچا ہوا فقیر ہے۔ چوتھے یا پانچویں آسمان کا باسی تو ہوگا ہی۔ آنکھیں اور اُوپر چڑھ جائیں گی تو آپ ہی آپ ساتویں آسمان میں جا پہنچے گا۔ اور مجھ سے پوچھے گا۔ حق! مانگوں، کھوڈوں، کیا مانگتے ہوں؟ وہ جی ہی جی میں کھوڈو بابا سے مانگنے لگا ---اور کیا مانگنے کاں ہے باباں؟ رام چرن کی جوروں روز میری جلیبیاں کھا کے بھی ہتھے نہیں

چڑھ رہی۔ بس وہ رام ہوں جائے توں اپنا بول بالاں!--- مگر جب اس نے شراب کا گلاس کھوڈو بابا کے سامنے رکھا تو بابا نے "حق" کا نعرہ بلند کر کے اسے فرش پر پٹخ دیا اور ایسا کرتے ہوئے اُس کا ہاتھ زخمی ہو گیا، اور پھر ہتھیلی کے خون کو ڈاڑھی سے صاف کرتے ہوئے وہ وہاں سے اٹھنے لگا تھا کہ چودھری اس کے قدموں پر گر پڑا اور دل ہی دل میں رام چرن کی جورو کو کوسنے لگا کہ وہ سیدھے سیدھے بس میں آجائے تو اسے اس جوکھم میں پڑنے کی کیا ضرورت ہے۔

بابا کے قدموں پر گرے پڑے چودھری ٹوٹے ہوئے گلاس کی کرچیاں اکٹھی کرنے لگا۔

"جو معاف نہیں کرتا کھوڈو۔" کھوڈو بابا پھر آرام سے بیٹھ چکا تھا۔ 'وہ بھی اُسی گناہ کا سزاوار ہوتا ہے جسے وہ معاف نہیں کرتا۔"

چودھری خوش ہو کر الماری سے جلیبیوں کا لفافہ نکال لایا جسے اُس نے رام چرن کی جورو کے لیے رکھا ہوا تھا۔ "جلیبیاں کھاؤں بابا۔" وہ سوچ رہا تھا، وہ آپ توں سالی کوئی اچھا کام کرتی نہیں، میں ہی اُس کے لیے تھوڑاں ثواب کماں لوں۔

کھوڈو بابا نے جلیبیوں کا لفافہ ہاتھ سے ایک طرف کر دیا۔ "نہیں، کھوڈو، میٹھا کھانے والا خوابِ غفلت کا شکار ہو جاتا ہے۔"

"خوابیں غفلت! کیا خوب!---" چودھری اپنی اُنگلیاں چومتے ہوئے گویا کھوڈو بابا کے الفاظ چوم رہا تھا۔

"اگر ہو سکے، کھوڈو، تو اللہ کے نام پر خشک روٹی کھلا دو۔"

چودھری کے پاس بندھو کتے کے لیے دو تین روٹیاں رکھی تھیں، وہ اپنے آپ کو بتانے لگا، ایک دن میں نہیں دوں گا تو بندھو کہیں اور سے مار لائے گا۔ وہ کپڑے میں لپٹی ہوئی روٹیاں نکال لایا اور انہیں بابا کے آگے رکھ کر پانی کا گلاس لانے کو اُٹھا۔

"صرف ایک۔" بابا نے ایک روٹی نکال کر ہاتھ میں لے لی "کیا میں تمہارے بندھو کا حق تو نہیں مار رہا؟"

"تم تو جانی جان ہوں بابا۔ تھوڑاں رُک جاؤں تو میں گھڑی بھر میں تازہ روٹیاں بنائے

دیتاں ہوں۔"

"نہیں، تازہ بندھو کے لیے بنالینا، کھوڈو۔"

کھوڈو بابا خدا کا شکر ادا کر کے منہ میں پہلا لقمہ ڈالنے لگا۔

"روٹی پر ذراں سا نمک ہی ڈال لوں، بابا۔"

"ہاں، کھوڈو، تھوڑا نمک ضرور دو۔" بابا پہلی بار ہنسا تو چودھری کو لگا کہ اُس کے جھونپڑے میں اُجالا ہو گیا ہے، "تاکہ نمک حرامی کے خوف سے تمہارا احسان سدا یاد رہے۔"

"ناں، باباں، ایسا مت کہوں۔" بابا کے سامنے نمک کی ڈبیار کھتے ہوئے چودھری کو اپنی شرمساری پر پیار آنے لگا تھا۔

بابا نے پانی کا گھونٹ بھرتے ہوئے اُس کی طرف گھور کر دیکھا جیسے وہ اپنے پیچھے بھی بیٹھا ہو۔ چودھری نے گھبرا کر اپنے اطمینان کے لیے سر موڑ لیا۔

"کسے دیکھ رہے ہو کھوڈو؟"

"جسے تم دیکھ رہے ہوں باباں، مگر میں تو یہاں ہوں۔"

"یہاں بھی کہاں ہو، کھوڈو؟" بابا شاید سرل نظر آنے کے لیے اپنی روٹی پر نمک چھڑکنے لگا۔

"باباں کی باباں ہی جانے۔" خود کو سمجھا کر چودھری بابا سے پوچھنے لگا۔ "باباں، ایک بانت بتاؤں گے؟ تم مجھے کھوڈوں کیوں بولتے ہو؟"

"کیونکہ میں بھی کھوڈو ہوں۔" اپنا لقمہ حلق سے اُتار کر بابا نے جواب دیا۔ "اپنے نام کے سوا میرے پاس ہے ہی کیا، جو کسی کو دوں؟ سو جو ہے، سبھوں کو وہی دے دیتا ہوں، یہی ایک اپنا آپ۔"

چودھری کا جی چاہا کہ بابا کو کھانے سے روک کر پہلے اس کی اُنگلیاں چوم لے۔ "باباں، اِدھر کئیں جھگیاں خالی ہیں۔ جس پر بھی انگلی رکھ دوں، وہ تمہاری۔ ایک کی چھت توں بہت اُونچی ہے، بہت ہوا ل دار ہے۔"

"نہیں، مجھے سب سے اُونچی چھت چاہیے، آسمان کی چھت، کھوڈو۔" بابا نے روٹی ختم

کر کے ہاتھ ڈاڑھی سے پونچھ لیے۔ "مجھے کوئی جھگی وھگی نہیں چاہیے۔ تھوڑی سی کھلی جگہ دے سکتے ہو تو ٹِک جاؤں گا۔"

چودھری نے ٹھان لی کہ جھگیوں سے تھوڑے فاصلے پر بابا کو وہ چبوترا دے دوں گا جہاں سے قبرستان شروع ہوتا ہے۔ اس کی نیک نیت میں خود اس سے بھی چوری چوری ایک کائیاں سی مسکراہٹ گھس آئی: اس طرح قبرستان کی زمین پر ہاتھ صاف کرناں بھی آسان ہوں جائیں گا۔

حق!--- تھوڑی دیر میں تھکے ماندے بابا کی آنکھیں مندنے لگیں تو اُس نے وہیں بیٹھے بیٹھے لیٹ جانا چاہا۔

"ٹھہرو، باباں۔ میں چدّر بچھائے دیتا ہوں۔"

"نہیں، موت گھڑی بھر کی ہو، یا سدا کی، کچی مٹّی پر ہی ہونی چاہیے۔ حق!"

کھوڈو بابا لیٹتے ہی خرّاٹے بھرنے لگا اور چودھری اپنی جیب سے دن بھر کی کمائی نکال کر گننے لگا تا کہ اِسے ٹھکانے لگا کے سوئے --- حق!--- نامعلوم بابا کے مانند صدا لگا کر اُس نے اپنے آپ سے کیا کہنا چاہا۔

(۲)

رکھے چودھری نے اپنی جھونپڑپٹّی کے لوگوں کو نامعلوم کیا کہانیاں گھڑ کر سُنائیں کہ عقیدت مندوں کا ہجوم دوسرے ہی روز شام کو کھوڈو بابا کے چبوترے پر جمع ہو گیا۔ بابا اپنے چبوترے پر اینٹوں کے تکیے پر پیٹھ ٹکائے نیم دراز پڑا تھا، اور ایسے معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی مردہ قبر کی گھٹن کی تاب نہ لا کر باہر کھُلے میدان میں آ گیا ہو اور اپنے آس پاس بیٹھے ہوئے حیرت زدہ لوگ اُسے پرچھائیوں کی مانند دِکھ رہے ہوں۔ اس نے اچانک 'حق' کا نعرہ لگایا جسے سُن کر بہتوں نے اپنے سَر آسمان کی طرف اٹھا لیے، مانو بابا کی آواز وہیں کہیں سے اُتری ہو۔ بعضوں نے اس کے پہلو میں اپنے نذرانے رکھ دیے تھے جن پر اُچٹتی نگاہ دوڑاتے ہوئے اُسے اخباری کاغذ سے سر نکالتی ہوئی ایک سوکھی روٹی دِکھائی دی۔ اس نے آگے جھک کر روٹی اٹھالی

اور اُسی دَم کھانا شروع کر دیا، اور جتنی دیر میں ایک شخص دوڑ کر پانی کا جگ بھر لایا، اُسی دوران اس نے روٹی پیٹ میں اُتار لی۔

''حق!'' بابا کا منہ ابھی پانی سے بھرا ہوا تھا۔ اس کی آواز کے ساتھ ہی گویا کدال کی چوٹ پڑنے پر جنگلی جھاڑیوں کے عقب سے قدرتی چشمے کی ایک دھار پھوٹ آئی۔

بابا کی ڈاڑھی مونچھوں میں جل تھل ہو گئی تو عقیدت مندوں کی آنکھیں اپنے پائینچے اُٹھا کر باہر نکل آئیں اور بابا پھر قبرستان کی طرف پشت کر کے دوسرے نذرانوں پر جھک گیا اور پگڑی اٹھا کر ایک ننگے سر والے کو دے دی۔ ''لو۔ کھوڈو!'' اور چادر، ایک ننگے بدن والے کو۔ ''لو، کھوڈو۔'' اور گوران شہد سے بھری ہوئی شیشی، ایک پھیکی شکل والی کو، اور جوتے --- اس نے ایک پھٹے پیروں والے بوڑھے کو بلایا۔ ''آؤ کھوڈو، یہ لو۔''

اس پر بدھوا چمار اٹھ کھڑا ہوا ''پر ہمار تو تمار کھاتر سگھرا دن کھرچ کر دیا، بابا۔ ایسا جادو کا جوتا بنے ہے کی ہر سانج کو پھٹ پڑے۔''

بڈھے نے جلدی سے جوتے پہن لیے کہ بدھوا کے کہنے پر کہیں بابا کی نیت نہ بدل جائے، اور خوشی سے کانپنے لگا۔ ''بابا، میری بہو ہمیساں کہے تھی، پھکر کاہے کو کرتے ہو باپو؟ مر جاؤ گے تو جوتے پہنا کے ہی بھیجوں گی۔'' معلوم ہوتا تھا جیسے بڈھا دیوانہ وار ناچنا چاہ رہا ہے۔

حالانکہ مطلع بالکل صاف تھا، پھر بھی آسمان سے دو چار بوندیں اُن کے گالوں پر آگریں اور انہیں بڑی فرحت محسوس ہوئی۔

بڈھے کے بعد بابا نے چودھری کو بلایا۔

''یہ لو۔'' اُس نے اپنے چبوترے کی مٹھی بھر مٹی رکھے چودھری کو دی جو اس نے ویسے ہی اپنے سر میں ڈال لی جیسے بابا نے ڈالی تھی۔

بابا کو ایک لفافہ اور نظر آ گیا جس میں لڈو رکھے تھے۔ وہ شاید سوچ رہا تھا، اس کا کیا کرے، کہ مانو اپنی پشت سے اسے کسی کی آواز سنائی دی۔ ''ارے ہاں۔'' وہ پہلے کی طرح آگے پیچھے کو دایاں بایاں بنا کے بیٹھ گیا۔ ''یہ لو لڈو تم سب بانٹ کر کھالو۔'' اُس نے لفافہ بائیں

طرف چبوترے سے گرا دیا۔

"اِدھر توں کوئی نہیں باباں۔" چودھری نے اُس طرف جھانک کر کہا۔

"تم تو عقل کے اندھے ہو، کھوڈو۔ مٹّی کو سر میں اچھی طرح مَل کر دیکھو۔ وہ ایک بوڑھیا، دو جوان اور تین بچّے کون بیٹھے ہیں؟"

"کہاں؟"

"اور سُلو! جو قبروں سے نکل کر آتے ہیں وہ آنکھوں سے نہیں، سر سے دِکھتے ہیں۔"

شاید سبھوں کو اپنے سَروں سے چھیوں مُردے قبرستان کے کنارے بیٹھے دِکھنے لگے تھے۔ چند تو ڈر گئے مگر کھوڈو بابا کے ہوتے ڈر کیسا؟ اس لیے وہ ڈرے ڈرے بھی بیٹھے رہے۔

بابا نے انہیں بتایا۔ "تم سب بھی تو اِتنے ہی زندہ ہو جتنے اپنے گمان میں --- بولو، صحیح ہے یا غلط؟"

"پوراں صحیح، باباں، پوراں صحیح!"

"مُردوں سے پیار کریں، کھوڈو، تو اُن میں جان پڑ جاتی ہے۔"

"ہاں، بابا۔" وہ پھیکی شکل والی عورت بولی جسے گوران شہد کی شیشی ملی تھی --- "انہوں تا جی ہکیم موجھے بولے تھے، مدھو چاٹو گی، بھلی او ک، تیں جی پڑو گی۔"

اِدھر سے دو چار جوان ہمّت کر کے اُدھر قبرستان کی جانب جا بیٹھے۔

"شاباش! ہمیشہ اسی طرح مِل جُل کر رہو، اور بانٹ کر کھاؤ۔"

جب اندھیرا ہونے لگا تو چودھری نے ایک آدمی کو دوڑانا چاہا کہ لالٹین جلا کر لے آئے۔

"نہیں۔" بابا نے اُسے ٹوک دیا۔ "انسان کے سِوا کسی اور جاندار کو بھی بتّی جلاتے دیکھا ہے، کھوڈو؟" بابا نے آسمان کی طرف دیکھا۔ "اوپر دیکھو۔ بتّیاں ہی بتّیاں روشن ہو رہی ہیں۔ اب تم جاؤ۔" اُس نے سبھوں سے مخاطب ہو کر کہا۔ "حق! حق!" اُس نے اپنے آپ کو 'حوالے' کرنے کے لیے لیٹنے سے پہلے ہی آنکھیں موند لیں۔

رکھا چودھری بھی سب کے پیچھے پیچھے اپنے جھونپڑے کی جانب ہو لیا۔ ہولے ہولے

چلتے ہوئے اُس نے بینڈ ماسٹر اور اس کی بیوی کی طرف دیکھا جو اس کے آگے تھوڑے فاصلے پر ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے چلے جا رہے تھے۔ وہ سوچنے لگا۔ اسی لیے تو سالاں باجہ بجا تاں ہے تو آواز آسمان تک جاں پہنچتی ہے---اسے پھر اپنی چرن داس کی جورو کا خیال آنے لگا۔ باباں نے ٹھیک کہا ہے، بانٹ کر کھاؤ۔ پر چرن داس کی جوروں کوئی کھانے پینے کی شے توں ہے نہیں، اور ہوں بھی، تو وہ تو قابوں میں ہی آنے میں نہیں آں رہی۔ چرن داس کوں کھاؤں؟---وہ اپنے آپ کو سمجھانے لگا کہ وہ اُسے اپنے دل سے ہی نکال دے۔ پر سالی پہلے دل میں قدم رکھنے پر راضی ہوں تو نکالوں بھی---اس کی آنکھوں میں بے بے بشیراں کی بیوہ بیٹی کا چہرہ گھومنے لگا---کتنی سیدھی اور دین دار عورت ہے۔ میں کیوں ناں بے بے سے اُسی کاں ہاتھ مانگ لوں؟ دیکھاں دیکھی میں بھی روزے نماز کی عادت ڈال کر سدھر جاؤں گا۔ چالیس کی ہے تو کیاں؟ میں بھی تو پورے پچاس کوں پیچھے چھوڑ آیا ہوں۔ وہ بڑی سنجیدگی سے سوچ رہا تھا---پر ایک بانت ہے۔ جھوٹ موٹ ہی سہی، بیوہ نے میرا دل جیتنا ہے تو وہ بھی چرن داس کی جوروں کی طرح بس ناں ناں کرتی رہے---حق! ---وہ خوش ہو کر بے اختیار بول اٹھا۔

(۳)

اگلے روز پھر کئی لوگ کھوڈو بابا کے چبوترے پر چلے آئے۔

”ری شیداں!“ ہرنی نے اپنی پڑوسن کو آگے جاتے ہوئے دیکھ کر اُسے تیزی سے جا لیا۔ ”تو بھی اِدھل بابا کے مکھیلے پَل آئی تھی---کیا؟ تو موجھے بھی اپنے ساتھ لے لیا ہوتا۔“

”منہ میں کھاک! مکمرا کیوں؟ بابے کا چبوترا کہو۔“ وہ ذرا رک کر چبوترے کی طرف دیکھنے لگی۔ ”دِکھنے میں تو کوئی مکمرا ہی لگے ہے۔“

”میں تو کہوں، شیداں، جے جو پھکبل ہوتے ہیں ناں---کیا؟---بڑے پہنچے ہوئے لوک ہوتے ہیں۔“ ہرنی کا آدمی کہا کرتا، میری اَورت باتیں کیا کرتی ہے۔ کلکاریاں مار مار کر

دل موہ لیتی ہے۔ ''مل کر بھی کپڑے جھاڑتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں، اور ملنے کو جی چاہے تو جدھل بھی من آجائے اُدھل ہی لیٹ جاتے ہیں اور آ کھلی سانس بھلنے لگتے ہیں --- کیا؟ ---''

کھوڈو بابا کے قریب پہنچ کر یہ لوگ چوکنے ہو کر ٹھہر گئے۔

اَن گنت بھڑوں کی ایک اُڑتی چھت بابا کے سر پر چلی آرہی تھی۔ ''گھبراؤ نہیں، کھوڈوؤ، کاٹتی نہیں۔'' وہ بڑے چین سے مسکرا رہا تھا۔ ''ہماری تمہاری طرح بھنبھنا کر خوش ہوتی ہیں۔''

تھوڑی دیر میں بھڑوں کی بھنبھناتی چھت بابا کے سر سے بہت آگے اُڑ گئی اور لوگ چبوترے کی ڈھلان کے نیچے براجمان ہوگئے، چند اِدھر ہی اور چند چبوترے کی دوسری جانب قبرستان کے کنارے، جہاں کھوڈو بابا نے مُردوں کو بھی پہچان لیا۔ ''ارے تم سب اِدھر ہی کیوں گھسڑ بیٹھے ہو، کچھ اُدھر اُن لوگوں کے ساتھ جگہ بنالو۔''

بابا اور چودھری کی آنکھیں بھی چار ہوگئیں۔ ''کیوں چودھری، مزے میں ہو؟'' پھر اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر وہ بولا ''مزے میں کیا خاک ہوگے، جو اتنی بڑی چھت کے نیچے اکیلے بسر کرتا ہے، اُسے اور چارہ ہی کیا ہے؟ قبر میں کروٹیں لے لے کر جسم کو گھماتا پھراتا رہتا ہے۔''

''ہم تو اپنی قبروں میں ایسے سوئے ہوتے ہیں کہ ہمیں دُنیا جہان کی خبر نہیں رہتی۔''

کوئی بولا ہی ہوگا جو بابا نے اس طرف تاکا۔ ''میں چودھری کا کہہ رہا ہوں، تمہارے تو کروٹ بدلنے کی جگہ ہی نہیں ہوتی۔''

''میں نے فیصلاں کرلیاں ہے بابا'' چودھری کہنے لگا۔ ''اگلے ماں ہی اپنی شادی بناں لوں گا۔''

''تم سے تو وہی شادی کرے گی چودھری۔'' آج بے بے بشیراں بھی آئی ہوئی تھی۔ ''جس نے تمہاری ناک کی دُھنوں میں ڈوب مرنا ہو۔'' سب ہنسنے لگے۔

چودھری کا ماتھا ٹھنکا کہ کہیں یہاں بھی چراغ گل نہ ملے۔ اس نے تہیہ کرلیا کہ وہ کل دن نکلتے ہی بشیراں بے بے کی جھگی میں گرم گرم جلیبیاں لے کر پہنچ جائے گا۔ دو چار میٹھی باتوں میں

ہی ڈھیلی پڑ جائے گی۔ باقی رہ گئی اُس کی بیوہ بیٹی ستارہ، تو وہ بے چاری تو گئو کی گئو ہے۔ اُسے اس سے کیا کہ کوئی ناک سے بولتا ہے یا دائیں یا بائیں کان سے؟ شادی کے بعد وہ بے بے بشیراں کو بھی اپنے پاس ہی اٹھالائے گا۔ بوڑھیا اکیلی اپنی جھگی میں کیا کرے گی؟ یہاں گھر کا کام کاج بھی سنبھال لے گی۔ اور اس کی جھگی---اس نے سوچا، بڑے موقع کی جھگی ہے۔ سامان سمیت بیچ دے گا۔ جھگی کی قیمت کا اندازہ لگا کر وہ بے بے بشیراں کی بیوہ بیٹی کو بھی بھول گیا۔ پانچ اوپر پورے تیس سینکڑے۔ یا پھر پانچ اوپر اٹھاراں بیس سینکڑے تو کدھر گئے ہی نہیں ---اس کی آنکھیں اچانک کھوڈو بابا کی آنکھوں سے ٹکرا گئیں اور اسے لگا کہ بابا نے اس کے من کو ٹٹول لیا ہے۔ اور اس نے فوراً ٹھان لی کہ بے بے بشیراں کی جھگی سے جو رقم وصول ہو گی، اس کی پائی پائی خرچ کر کے وہ اسی چبوترے پر بابا کی فرسٹ کلاس قبر بنادے گا۔ بابا کی قبر کے سرہانے وہ سنگِ مَرمَر لگوائے گا جس پر بابا کے نام اپنے شاعر دوست سورج نرائن زخمی سے پھڑکتے ہوئے شعر لکھوا کے کھدوائے گا---دل ہی دل میں ساری اسکیم تیار کر کے وہ مسکرانے لگا، اور اُسے بدستور دیکھتے ہوئے بابا بھی، مانو انہوں نے بیک وقت ایک ہی سوچ سوچی ہو۔

کھوڈو بابا کے درشنوں کے لیے آج پنڈت مُرلی دھر بھی آیا ہوا تھا۔ پنڈت نے تین جھگیوں پر قبضہ جما رکھا تھا، دو کو ایک بنا کے وہ اس میں اُپدیش دینے کا کاروبار کرتا تھا۔ اور تیسری میں اس نے رہائش اختیار کر رکھی تھی۔ اس کے پہلو میں سفید مونچھوں والا ایک گنجا شخص بیٹھا تھا جسے اس نے کبھی نہ دیکھا تھا۔ وہ ہنس کر اس سے پوچھنے لگا، کیوں، بڑے بھائی، تم اِدھر ہماری جھگیوں میں سے ہو، یا---اُس نے قبرستان کی طرف اشارہ کیا---اُدھر سے؟--- سفید مونچھوں والے کے گلے میں کچھ ایسی عجیب و غریب خنداں آوازیں پیدا ہوئیں کہ پنڈت چونک کر اس سے پرے ہٹ گیا۔ کھوڈو بابا نے پنڈت کا سوال سن لیا تھا اور اُس کی گھبراہٹ بھانپ لی تھی۔ اس نے پنڈت کی چوٹی اور تلک کی نسبت سے اسے پہچان کر مخاطب کیا۔"پنڈت کھوڈو، گیان مارگ ہمیں دوسروں سے دُور کر دے تو ہمیں اندھ وِشواس کے مارگ پر ہو لینا چاہیے۔ ہے نا؟"

''ہاں، بابا۔'' بابا کا جلال پنڈت کے دل و دماغ میں سرایت کرنے لگا تھا۔ اس نے بابا پر ایمان لے آنے کے اعلان کی خاطر اپنی کس کر بندھی اتنی بڑی چوٹی ڈھیلی کر لی اور ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

''تمہاری بات سن کر میرا جی خوش ہو گیا ہے۔''

''حق!---'' کھوڈو بابا تن کر بیٹھ گیا۔ ''مجھے کوئی مسخرہ سمجھتے ہو کھوڈو؟ میں تمہارا جی خوش کرنے کے لیے نہیں بول رہا۔ مجھے سمجھو اور محسوس کرو۔''

پنڈت کا چہرہ لٹک گیا۔

''جوڑے ہوئے ہاتھ کھول دو، پنڈت کھوڈو۔ اچھا بتاؤ'' وہ پوچھنے لگا۔ ''تمہاری سیدھی سادی ماں بڑی ہے جس نے تمہیں جنم دیا، یا اتنی بڑی چوٹی والے تم؟''

''میری ماں، دیالو۔''

''اسی طرح تمہاری پنڈتائی کا سارا بھرم بھی تمہاری سیدھی سادی بات سے ہے--- لو، میں تمہیں ایک بڑی سرل کہانی سناتا ہوں، صرف یہ بتانے کے لیے کہ اُتھلی باتیں کتنی گہری ہوتی ہیں۔''

''واہوں!--- وہوں!---'' چودھری کا چوکیدار کتا تیز تیز دوڑتے ہوئے اِدھر ہی آ رہا تھا--- ''ٹھہرو بابا، میں بھی بیٹھ جاؤں، پھر اپنی کہانی شروع کرنا۔''

''ہاں، آؤ، کھوڈو، بیٹھ جاؤ اور دھیان سے سنو۔ تمہارے ہی ہم ذات کی کہانی ہے۔'' اُن سب کی طرف نگاہ دوڑا کر بابا اپنی کہانی اکٹھی کرنے کے لیے ذرا رُک گیا۔ ''حق!--- حق! ---سنو۔ ایک بہت بڑے شہر میں ایک چھوٹا سا کتا تھا جو شہر کی سڑکوں پر مارا مارا پھرتا تھا۔''

''واہوں!---'' بندھو بھونکنے لگا۔ ''میری ہی کہانی تمہیں کس نے سنائی، بابا؟''

''ارے چپ!'' پنڈت کو غصہ آنے لگا تو اُس کے ہاتھ بے اختیار اپنی چوٹی کی گانٹھ کو کسنے کے لیے اُٹھ گئے۔ ''سننا ہے تو آرام سے سُن!''

''حق!'' کھوڈو بابا نے اپنی کہانی کو تھمتے پا کر آگے دھکا دیا۔ ''بے چارہ بازاری کتا تھا، پالتو

ہوتا تو مالک کی پھینکی ہوئی گیند ہی کو پکڑا پکڑا کر مکھن، ڈبل روٹی اور گوشت کھاتا۔ یہی نہیں، جب کبھی مالک اور مالکن کا جھگڑا ہو جاتا تو مالکن سے چوماچاٹی کے لیے اُسے اس کے بستر میں جگہ بھی ملتی۔"

"واہوں!---" بندھو سے پھر نہ رہا گیا۔ "تم بالکل دُرست کہہ رہے ہو بابا۔"

"ارے پھر؟" پنڈت نے اب کے اپنی چوٹی کو اتنے زور سے کسا کہ بندھو کی چیخ نکل گئی۔

"جان پیاری ہے، بندھو، تو ٹوکو مت۔" بے بے بشیراں بندھو پر ترس کھا کر بولی۔

"پنڈت کی چوٹی سے تو ہمارے بڑے مولوی بھی بد کتے ہیں۔"

"حق! آگے سُنو--- جس کا کوئی نام نہ ہو اس کے کئی نام ہوتے ہیں، یا پھر ایک یہی، کھوڈو۔ سو اُس بازاری کتے کو جس نے جہاں جو بھی نام دے دیا، قصابوں کے بازار میں کھوڈو کو ڈُلا کہتے تھے۔ یہاں وہ کبھی اِس دُکان کے سامنے اور کبھی اُس کے سامنے کوّوں، چیلوں پر نگاہ رکھتا اور اس اختیاری کام کے عوض قصاب دُکان بڑھانے سے پہلے اُس کے آگے چند ہڈیاں اور فالتو چھیچھڑے پھینک دیتے، مگر ایک دفعہ اُسے محسوس ہوا کہ قصاب آنکھوں ہی آنکھوں میں اُس کی گردن ناپ کر مسکرانے لگتے ہیں۔ تاکہ اس کا گوشت بھی بھیڑ کے گوشت میں ملا کر گاہکوں کو تھمادیں۔ بس پھر کیا تھا، اس نے خوف کے مارے اُدھر جانا ہی چھوڑ دیا۔ حق!---" آگے کی کہانی جوڑنے سے پہلے کھوڈو بابا لحظہ بھر کے لیے ٹھہر گیا۔ "پھر؟---پھر یہ ہوا کہ کوٹھیوں کے ایک علاقے میں اس کا معاملہ ایک پالتو کُتیا سے عین بیٹھ گیا۔"

شیداں اور ہرنی اپنی حیرت و مسرّت سے بے قابو ہو کر کانسی کی گھنٹیوں کے مانند بج اٹھیں۔

"یہ کُتیا ہمارے کھوڈو کو بڑے پیار اور نخرے سے واہوں نام سے بلاتی تھی۔"

"واہوں!---" بندھو نے پھر ٹوکا۔ "یہ بھی کوئی نام ہوا؟"

"بھائی میرے۔" کھوڈو بابا نے اُسے جواب دیا۔ "کُتیا کو انگریزی تھوڑا ہی آتی تھی جو اُسے ٹامی یا ٹائیگر کہہ کر بلاتی۔ وہ اُسے سیدھے سیدھے اپنی اصلی زبان میں ہی مخاطب کرتی

تھی۔ کپڑے کے ایک دھار مک بیوپاری کی پالتو کتیا تھی اور اپنے مالک کی طرح صرف روٹی اور سبزی اور مچھلی کھاتی تھی۔ اور سادہ اور صاف پانی پیتی تھی اور کوٹھی والوں کے ساتھ ہری کیرتن میں بھی شامل ہو جاتی تھی۔"

"یہ سچ مچ بڑی انوکھی بات ہے بابا۔" پنڈت نے پرسن ہو کر کہا۔

"آگے سنو۔ یہاں کھوڈو واہوں کے وارے نیارے تھے۔ شام ہوتے ہی وہ سب کی نظریں بچا کر کوٹھی کی دیوار پھاندتا اور دبے پاؤں اپنی محبوبہ کے پاس جا پہنچتا۔ پھر نہ معلوم انہیں کس کی نظر لگ گئی کہ کتیا بے سبب چل بسی۔"

"واہ!" بندھو اب کتیا کے بارے میں گہرائی سے سوچنے لگا تھا۔ "یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ --- کوئی سبب تو ہو گا ہی۔"

"سبب تو ہو گا، بہر حال مجھے اس کی خبر نہیں۔ کھوڈو اپنی محبوبہ کا دیا ہوا نام بھی کھو کر مہانگر کی سڑکیں ناپتا رہا۔ کچھ مل گیا تو کھا پی لیا، ورنہ اللہ اللہ کر کے جہاں پڑ گئے، وہیں پڑے رہے۔"

اسی اثنا میں بندھو کو قبرستان میں ایک کتیا نظر آئی اور وہ سب کچھ چھوڑ کر اُس کی جانب اُچھل گیا۔ سبھوں کی نظریں بھی اُس کے پیچھے پیچھے بھاگنے لگیں، مگر ابھی وہ اُس کتیا کے قریب پہنچا ہی تھا کہ بھونک بھونک اُلٹے پاؤں دوڑ آیا۔

"واہوں؟ یہ تو اپنی چھبیلی ہے۔" وہ حواس مجتمع کر کے بولا۔ "وہی جسے مرے تین ماہ سے بھی اُوپر ہو لیے ہیں۔"

"اس میں ڈرنے کی کیا بات ہے؟" بابا ہنسنے لگا۔ "کوئی ٹھکانہ نہ ملا ہو گا، اس لیے بے چاری واپس آ گئی......"

بندھو نے پھر قبرستان کی طرف نظر دوڑائی اور پہلے ذرا جھجک کر اور پھر تیز تیز دوبارہ اُسی طرف ہو لیا۔

"تمہاری کہانی، بابا۔"

"کہانی تو چل ہی رہی ہے --- کھوڈو نے تین چار مہینے تو جیسے تیسے گزار لیے، مگر کھائے

پیے بغیر چار ٹانگوں کو کیسے کھڑا رکھتا؟ سارے شہر میں اسے ایک نظر دیکھنے کی بھی کسی کے پاس فرصت نہ تھی۔ وہ بھی منہ چھپا چھپا کے پھرتا تھا، کیونکہ بڑے شہروں میں آوارہ کتوں کو گولی سے اڑا دیا جاتا ہے۔"

"پھر؟"

"پھر وہی ہوا جو بہت پہلے ہو جانا چاہیے تھا۔ ایک دن وا ہوں ......"

"مگر اب تو کھوڈو کا کوئی نام نہ تھا۔"

"ہاں، اب وہ بس کھوڈو کا کھوڈو رہ گیا تھا، سو جب ایک دن وہ بازار میں گر کر ڈھیر ہو گیا تو کسی کو پتہ ہی نہ چلا کہ کون ڈھیر ہو گیا ہے، یا کوئی ڈھیر بھی ہوا ہے یا نہیں۔ جس بھرے بازار میں وہ پڑا تھا وہاں دِنوں پڑا رہا اور کسی کو نظر ہی نہ آیا۔ وہ کوئی ہوتا تو کسی کو نظر آتا۔"

"مگر بابا۔" بندھو اور چھبیلی۔ بس اتنی سی دیر میں ہی ایک دوسرے سے مانوس ہو چکے تھے اور سب سے ہٹ کر برلبِ قبرستان ٹانگوں میں ٹانگیں ڈالے بیٹھے تھے۔ "کتے بے چارے کیا انسان نہیں ہوتے؟"

"ہاں، بندھو، کوئی سمجھے تو ضرور ہوتے ہیں۔" بابا کی بجائے پنڈت نے اسے جواب دیا۔

"مگر کوئی سمجھے، تب نا۔" وہی سفید مونچھوں والا پنڈت کے پڑوس سے گویا ہوا۔ "ہم انسان ہیں مگر ترستے رہتے ہیں کہ کوئی کتا سمجھ کر ہی پچکار لے۔"

اتنے میں ہی بابا پر نہ جانے کیا قلبی واردات بیتنے لگی کہ وہ یکبارگی سب سے غافل ہو کر آنکھیں بند کیے دھیمے دھیمے 'حق' کا وِرد کرنے لگے۔ حاضرین تھوڑی دیر تو اسے چپ چاپ دیکھتے رہے۔ پھر سب جانے کے لیے اُٹھ کھڑے ہوئے۔

بندھو کو چھبیلی کے ساتھ ویسے ہی جُڑا پا کر چودھری نے اُسے گالی بک کر کہا۔ "ارے اُنٹھ، یہ تمہارے عشق کاں ٹائم ہے یا چو نکیداری کاں؟"

(۴)

آج شام کو بھی عین اُسی وقت بہت سے لوگ کھوڈو بابا کے چبوترے پر جمع ہو گئے۔

''تمہاری کل کی کہانی تو ادھوری رہ گئی بابا۔'' پنڈت آج بھی آیا ہوا تھا۔
''کہانیاں ہوتی ہی ادھوری ہیں۔'' کھوڈو بابا نے کہا۔ ''کیونکہ وہ ان لوگوں کی ہوتی ہیں جو یہ کہہ کے چلے جاتے ہیں، ابھی آتے ہیں، مگر وہ کبھی نہیں آتے۔ ہم ایک انھی کے انتظار میں ہوتے ہیں مگر کوئی اور ہی چلے آتے ہیں۔''
''میری سمجھ میں نہیں آتا، بابا۔'' سوال کرنے والا سبزی کی ریڑھی لگاتا تھا اور طبیعت کا کڑوا تھا، اس لیے کریلے کے نام سے پکارا جاتا تھا۔
''میری سبزی ایک دن پڑی رہ جائے تو بو چھوڑنے لگتی ہے۔ تمہارے داہوں کی لاش اتنے بھرے بازار میں پڑی رہی اور کسی کو بو تک نہ آئی؟''
''بھرے بازاروں میں سینکڑوں بوئیں گھل مل رہی ہوتی ہیں کھوڈو، اس لیے کسے خبر، کونسی بو کہاں سے آرہی ہے؟'' بابا نے اپنی بات پوری کرتے ہوئے اچانک بندھو کو دیکھ لیا، جو سب سے الگ تھلگ قبرستان کی طرف منہ اٹھائے اُداس سا بیٹھا تھا۔ ''آج مرحومہ نہیں آئی؟''
''ہاں، بابا، پتہ نہیں، کیوں؟''
''کیا معلوم طبیعت بگڑ گئی ہو۔''
''بڑی عجیب باتیں کرتے ہو بابا۔ مرنے کے بعد سب روگ ووگ چھٹ جاتے ہیں۔''
''مرنے کے بعد کوئی جی سکتا ہے تو بیمار بھی کیوں نہیں ہو سکتا؟'' سب پر نظریں گھماتے ہوئے بابا کی آنکھوں میں ایک بڑی خوبصورت گندی سی لڑکی بھر آئی۔ وہ رُک کر اسے دیکھنے لگا مگر لڑکی کو لگا کہ وہ اس کی بکری کو دیکھ رہا ہے، جو اس کی پشت پر اپنا خالی منہ ہلائے جا رہی تھی--- ''یہ میری بکری بالو ہے بابا'' --- وہ اسے بتانے لگی--- ''بڑی شریر ہے، میں اسے سنگ لے آئی ہوں۔ تمہیں سُن کر کام کی بندی بن جائے گی'' --- بابا اسے کوئی جواب دینا چاہتا تھا مگر ایک پوپلی بوڑھیا اس کے سامنے آکھڑی ہوئی، جس کا خشک و خاکی چہرہ بے شمار جھریوں سے اَٹا ہوا تھا، مانو عمر رسیدہ زمین کا کوئی ٹکڑا قحط کے مارے جا بجا لکیروں میں پھٹ گیا ہو۔
''موجھے سدا کا نکھار رہتا ہے۔''

''کون سا بخار؟'' بابا نے بوڑھیا سے پوچھا اور پھر آپ ہی اپنے آپ کو بتانے لگے۔ ''اچھا سدا کا بخار۔''

بوڑھیا اپنے پلو کی ایک گانٹھ کھول رہی تھی۔ ''کھیراتی دوا کھانے سے یہ گولیاں تو مل گئی ہیں پر ڈاکٹر بولتا ہے، اچھی کھوراک بھی کھاؤں۔'' پلو کی گانٹھ کھل گئی تو اس نے وہاں سے ایک پڑیا نکال کر اُسے گولیاں دکھائیں۔

کنویں کا پانی گویا بابا کی آنکھوں سے اُنڈل اُنڈل کر قحط زدہ زمین کو سیراب کرنے لگا۔

''تمہارا کوئی ہے ماں؟''

پنڈت نے بابا کو بتایا کہ بے چاری کا ایک اپنا آپ ہی اُس کا اپنا ہے۔

''وہ بھی کہاں اُس کا اپنا ہے کھوڈو۔''

بابا نے بکری والی چھوکری کو اپنے پاس آنے کا اشارہ کیا تو وہ اور اُس کے پیچھے پیچھے اس کی بکری بھی دوڑ کر آ گئے۔

''میری ایک بات مانو گی، کھوڈو؟''

''ہاں کھوڈو بابا، جو بھی کہو، مانوں گی، بس ایک جے نہ کہیو، بیاہ کر لیو۔''

''کیوں؟'' بابا نے دلچسپی لے کر پوچھا۔

''کیوں کیا؟ وہ مرڈوا مجھے بھی مجھ سے چھین لیوا اور میری بکری بھی۔''

''نہیں، تم ہماری اس کھوڈو ماں کو ہر روز اپنی بکری کا دودھ پلایا کرو، پھر ہمارا خدا تمہارے لیے ایک خاص نواب ڈولہا بھیجے گا۔''

''تو پھر اپنے کھدا سے کہیو بابا، ایک ناہیں، دو نباب بھیج دیوے۔ ایک کھراب نکلا تو ڈوجا تو ہو گا--- آؤ میا، ہر روج آ کر ایک پایا کچا دودھ لے جایا کرو۔''

وہ پرے ہوئیں تو پنڈت بابا سے کہنے لگا۔ ''بابا، تو پھر تمہارا وہ وااہوں شہر کی پٹری پر پڑا رہ گیا؟''

''ہاں، مگر ایک دن اپنی بو کی تاب نہ لا کر مرے مرے اُٹھ کھڑا ہوا اور شہر کے باہر کا رُخ اختیار کیا، تاکہ کہیں کچی زمین مل جائے تو گڑھا کھود کر اپنے اوپر مٹی ڈال کر پڑ جائے۔''

بندھو کچھ یاد آنے پر کھڑا ہو گیا۔ ”بابا، چودھری کے جھونپڑے کے پچھواڑے تم ہی نے گڑھا کھودا تھا؟“

”ہاں، کھوڈو، کیوں؟ اُس رات جب میں وہیں سویا تھا، میری آنکھ بہت سویرے کھل گئی۔ باہر آ کے میری نظر جو پھاوڑے پر پڑی تو میں اپنی خواہش پر قابو نہ پا سکا۔ ایک آدمی اس میں بڑے آرام سے لیٹ سکتا ہے۔“

”مگر کون آدمی، بابا؟“

”کیوں، کوئی بھی۔ تمہارا کھوڈو چودھری ہی۔ میں نے سوچا، وقت آنے پر خواہ مخواہ بھٹکتا پھرے گا۔ اس نے مجھ پر اتنی مہربانی کی ہے، میں بھی کچھ کر دوں۔“

رکھا چودھری گھبرا کر قہقہانے لگا۔

”کیا پھر وا ہوں شہر سے باہر نکلنے میں سپھل ہو گیا؟“ پنڈت نے بابا سے سوال کیا۔

”پہلے تو یہ ہوا کہ شہر سے باہر نکلنے کی کوشش میں وہ شہر کے اور اندر گھستا چلا گیا اور پھر ایک دن کہیں اندر ہی اندر سے بر آمد ہو کر اس نے اپنے آپ کو اچانک شہر کے باہر پایا۔ مگر کیا فائدہ؟ وہ جہاں بھی پہنچے رگڑر گڑ کر زمین کی کھدائی شروع کرتا تھا، وہیں زمین کا مالک اس پر لاٹھی لے کر چڑھ دوڑتا تھا۔“ بابا نے ذرا ٹھہر کر اپنے بیان کو جاری رکھا۔ ”ساری زمین تو لوگوں نے اپنے نام بندھوالی ہے۔ کوئی ایک فٹ ٹکڑا بھی تو نہیں، جو خدا کے نام پر بچارہ گیا ہو۔“

”خدا پر ایسی کونسی بپتا آن پڑی جو اس نے ساری زمین اِن بے رحموں کو بیچ دی؟“

”پتہ نہیں، کیا؟ پر کوئی ایسی ہی بپتا ہو گی، ورنہ آدھی نہیں، تو ایک چوتھائی ہی اپنے نام پڑی رہنے دیتا۔“ پتہ نہیں بابا کے دل میں یکبارگی کیا آئی، اس نے ہاتھوں کو کتے کی اگلی ٹانگوں کے مانند زمین پر ٹکا کر گھٹنوں کے بَل چبوترے کا ایک چکر لگایا۔

”میں---ں---ں!---“

”چپ!“ اس خوبصورت چھوکری نے اپنی بکری کے منہ پر ہاتھ مار کر کہا ”اسی لیے تمہیں ساتھ نہیں لاتی تھی۔“

''واہوں! واہوں!'' بندھو نے بابا کو مخاطب کر کے کہا۔ ''کیا ناٹک کر رہے ہو بابا؟ اپنی کہانی پوری کرو۔''

''آگے کی کہانی یہ ہے۔'' بابا انہیں بتانے لگا۔ ''کہ وہ سگ زادہ بھاگ بھاگ کر کسی نئی بستی میں آ پہنچا اور پھر وہاں سے بھی پٹ کر ایک اور بستی میں، اور پھر اپنی ماہ و سال کی بھاگا بھاگ میں اسے یاد ہی نہ رہا کہ وہ مر چکا ہے اور بھولے بھولے ہی زندہ ہے۔'' بابا کی آواز اس کے باطن کے سیلاب میں ماند پڑنے لگی تھی۔ ''مگر بھٹکتے ہوئے جہاں کہیں اسے کچی مٹی پر چین سے بیٹھنا میسر آ جاتا اس کی باچھیں کھِل جاتیں اور وہ اپنے پنجوں سے بے اختیار زمین چھیلنے لگتا۔ لاعلم سا، کہ وہ ایسا کیوں کرتا ہے۔'' بابا نے اپنا ایک ہاتھ ایک چھوٹے سے گڑھے میں ٹکالیا اور چبوترے پر کئی چھوٹے چھوٹے گڑھوں پر آنکھیں گاڑلیں جو شاید اسی نے اپنے ناخنوں سے مٹی چھیل کر بنا رکھے تھے۔

''ارے بابا، میں بتاؤں؟'' ایک آوارہ نوجوان اپنا منہ بند نہ رکھ سکا۔'' وہ سگ زادے تم ہی ہو۔''

''بابا تیں کو سگ جادہ دِکھتا ہے کا؟''

''دُکھوں کا پہاڑ سامنے ہو تو سگ زادہ بھی آدمی دِکھنے لگتا ہے۔''

''واہوں!---وہوں!---و---!''

''میں---یں---ں---ں!---''

''حق!---حق!---حق!---حق!---''

(۵)

آج صبح کے وقت کوراں تائی نے چبوترے پر کھوذو بابا کے لیے روٹی لانا تھی۔ وہ پو پھٹتے ہی دسوں گھروں کی جھاڑ پھونک کے لیے اپنی جھگی سے نکل پڑتی تھی اور وہیں کسی گھر میں گالیاں اور روٹیاں پھوڑ پھوڑ کر پیٹ بھر لیتی اور اپنا سارا کام ختم کر کے شام کو جھگی میں لوٹتی اور مٹی کا دِیا جلا کر اس طرح کھاٹ پر پڑ جاتی جیسے اپنا انتم سنسکار کر کے لمبی تان رہی ہو۔

وہ کل بابا سے کہہ گئی تھی۔ ''میں کام پر نکلنے سے پہلوں روٹی دے جاؤں گی، جبھی بھوک لگے چکھ لینا۔''

کھوڈو بابا سوچ رہا تھا کہ تائی کے آنے میں اتنی دیر کیوں ہولی ہے۔ کیا وہ آپ ہی اس کی جھگی میں جا کر پتہ کرے؟ اسی اثنا میں اسے بندھو دوڑ دوڑ کر چبوترے کی طرف آتے ہوئے دکھائی دیا۔ وہ اپنے منہ میں اخبار کے کاغذ میں لپٹی ایک روٹی دابے ہوئے تھا جسے اس نے بابا کے سامنے ڈال دیا اور سانس لے کر بولا۔ ''بابا، تائی کو خون کی اُلٹی آئی ہے۔ میں یوں ہی اس کی جھگی میں جا نکلا تو کہنے لگی، بابا کے لیے روٹی تو میں نے پکالی ہے مگر مجھ میں چلنے کی ہمت نہیں۔ تم ہی جا کے دے آؤ اور اللہ کے نیک بندے کو میری رام رام بھی کہہ آؤ۔''

''اللہ اُس پر رحم کرے!'' کھوڈو بابا نے تائی کے لیے دُعا مانگی اور روٹی ہاتھ میں لے لی۔ تائی نے روٹی پر بڑے سلیقے سے چٹنی بھی بکھیر رکھی تھی۔ ''حق!''

''واہوں!--- بڑی اچھی عورت ہے بابا اور بڑی دُکھی۔'' بندھو کو خواہش ہوئی کہ خوب زور سے بھونکتا چلا جائے۔ ''اگر تم اس کے دُکھ دُور نہیں کر سکتے بابا، تو تمہارے اتنا بڑا فقیر ہونے کا کیا فائدہ؟''

''فائدہ صرف سیدھے اور عام لوگوں سے پہنچتا ہے۔'' کھوڈو بابا نے روٹی گول کر کے دانتوں سے لقمہ بھر کاٹی اور کھانے لگا۔ ''فقیر کمینے کو تو اپنی فکر لگی رہتی ہے، مورکھ کھوڈو۔''

''واہوں! دیکھو، یا تو صرف مورکھ کہو یا صرف کھوڈو۔''

''دونوں کا مطلب ایک ہی ہے مورکھ۔'' بابا ہنس دیا۔ ''کھوڈو تائی کا خیال رکھا کرو۔''

''میں تو سب کا خیال رکھتا ہوں۔ پر کس کس کا رکھوں۔ ہر ایک کی جان ٹنگی ہوئی ہے۔''

بندھو بابا کو جھونپڑپٹی کے دیگر افراد کے بارے میں بھی بتانے لگا۔

''وہ بڈھا جسے تم نے بدھو چمار کا جوتا دیا تھا، کل رات سے آخری ہچکیاں بھر رہا ہے اور جوتا ڈال کے لیٹا ہوا ہے اور اپنے بیٹے سے بار بار کہہ رہا ہے، مجھے جوتوں سمیت وداع کرنا، ورنہ بھوت بن کے لوٹ آؤں گا--- بابا!'' بندھو نے شاید پہلے ہی سے بابا سے یہ سوال پوچھنے

کاارادہ کر رکھا تھا۔ ''کیا تمہیں رات کے وقت اکیلے اس سنسان قبرستان میں ڈر نہیں لگتا؟''

''کس کا ڈر؟''

''بھوتوں کا بابا، اور کس کا؟''

''بھوتوں سے تو تم بھی نہیں ڈرتے، کھوڈو۔''

''نہیں، بابا۔ میں تو بہت ڈرتا ہوں۔''

''تو پھر ---''

بندھو نے بابا کی آنکھوں میں دیکھا اور اپنے آپ کو روکنے کی کوشش کے باوجود بھونکنے لگا۔

''تم مورکھ کے مورکھ ہو کھوڈو۔''

''نہیں، بابا، تم بھوت نہیں ہو، اور اگر ہو بھی، تو تم سے ڈر کیسا، تم اپنے بابا ہو۔ جانتے ہو، کیا، بابا؟'' اچانک یاد آنے پر وہ بابا کو بتانے لگا۔ ''کل اُچّت سیٹھ --- وہ سب سے غریب ہے، اس لیے عبدل چچا اسے مذاق میں اُچّت سیٹھ کہا کرتا ہے۔ اس نے اپنی جھگی عبدل چچا سے ہی کرائے پر لے رکھی ہے اور کبھی کرایہ ادا نہیں کرتا۔ اُچّت سیٹھ بھی کل شام کو تمہاری باتیں سننے کے لیے آیا ہوا تھا۔ یہاں سے لوٹ کر اس نے اپنی جھگی کے دروازے پر دیسی شراب کا پورا اَدّھا غٹ غٹ خالی کر دیا اور مجھے زبردستی اپنے ساتھ بٹھالیا اور بتانے لگا، سُنو، کھوڈو بابا جس سگ زادے کی کہانی سُنارہا تھا۔ جانتے ہو، وہ کون ہے؟ میں --- میں ہی وہ سگ زادہ ہوں۔ دیکھو میری طرف --- بابا، اس نے بھی تمہاری طرح اپنے دونوں ہاتھ زمین پر ٹکالیے، اور اتنا اچھا بھونکنے لگا کہ اس کی آواز میں آواز ملانے پر مجھے صرف وہی سنائی دیا۔ وہ بھی کوئی کتا ہوتا ہے بابا، جو سنائی نہ دے۔'' بندھو شاید اپنی شرمندگی دور کرنے کے لیے خوب زور سے بھونکنے لگا، جس پر بابا نے اُسے متنبہ کیا کہ آہستہ بولے۔ ''اچھا، لو، آہستہ بولتا ہوں۔ اُچّت سیٹھ کا کہنا ہے کہ ہم سبھی اپنے بھوت ہیں، جو مَوت کے بعد اپنی بو کی تاب نہ لا کر چار ٹانگوں پر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ تم یقین نہیں کرو گے بابا، اس نے تو ذہن پر زور ڈال

کر مجھے اپنی موت کی تاریخ بھی بتا دی۔ بڑا دُکھی آدمی ہے۔ اپنا دُکھ بھولنے کے لیے شراب پیتا رہتا ہے مگر پی کر اسے اپنے دُکھ اور یاد آنے لگتے ہیں۔" کتے کی واہوں وہوں غم و غصہ سے پھر اونچی ہونے لگی۔ "پچھلے سال اس کی بیوی --- اس بیماری کو کیا کہتے ہیں --- آتشک سوزاک سے مرگئی تھی۔ کل شراب کے نشے میں دُھت ہو کر وہ مجھے بتا رہا تھا، میں اپنی بیوی کو کیسے رووّں؟ میں تو اس سے بھی چار سال پہلے اسی دن مر گیا تھا جب ایک ٹورسٹ نے مجھے ایک خوب ٹھسّے والی عورت لانے کو کہا تھا اور میں سمجھا بجھا کر اپنی بیوی کو ہی بنا سنوار کے لے گیا تھا۔ گھر میں پیسے ہوں گے تو اور کیا چاہیے؟ --- وہ رونے لگا، بابا، اور پوچھنے لگا، کیا میں تمہیں اپنا بھوت معلوم نہیں ہوتا۔ میں نے اس کی طرف آنکھیں جھپکا کر دیکھا۔ کبھی وہ سارے کا سارا صاف نظر آجاتا تھا، اور کبھی اس کے سارے چہرے پر صرف ناک، یا صرف منہ، یا صرف آنکھیں --- میں تو وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا۔" اپنی بدحواسی پر حاوی ہونے کے لیے بندھو دو چار بار بے مطلب بھونکا۔

"ارے! تم نے روٹی کھانے سے ہاتھ کیوں روک رکھا ہے؟" وہ بابا سے پوچھنے لگا۔ "ایک تو تم پیٹ بھر کر کھاتے نہیں ہو، دوسرے جتنا کھاتے ہو، وہ بھی اتنا سا، جتنی میں دِکھاوے کی چوکیداری کرتا ہوں۔ میں تمہیں سچ سچ بتاؤں؟ رکھے چودھری کی دو روٹیوں سے میرا پیٹ نہیں بھرتا۔ میں ہر جھگّی سے کچھ نہ کچھ چرا کر کھانے کی تاک میں لگا رہتا ہوں اور اب تو مجھے چھبیلی کے لیے بھی ہاتھ پیر مارنے پڑیں گے۔ یہ چھبیلی دو دن سے کہاں غائب ہے بابا؟ میرا تو خیال ہے اس کے مرنے ورنے کی خبر جھوٹی تھی۔ وہ اپنے کسی یار کے ساتھ رفو چکر ہو گئی ہو گی۔ اس سے لڑ جھگڑ کر آئی ہو گی۔ اور اب غصہ ٹھنڈا پڑنے پر واپس اُسی کے پاس چلی گئی ہے۔ مجھے تو وہ اپنی عزت آبرو کے پردے کے لیے برتتی ہے، اور بس۔ اس سے تو اچھا ہے کہ مَر بھی گئی تھی تو مَری پڑی رہتی۔ ہہ ہا۔ واہوں ---!" اپنے غصّے کا اظہار کرتے ہوئے بندھو ایکا ایکی ہنسنے لگا۔

اس میں ہنسنے کا کیا مقام ہے کھوڈو؟"

"ہے، بابا، ہے! مجھے رام چرن کی جورُو کا خیال آگیا ہے۔" بندھو اور کھل کر ہنسنے کے لیے ذرا رُک گیا۔ "کل رات رام چرن کی جورُو دودھ والے جانگلو کے ساتھ چمپت ہو گئی۔ رکھے چودھری کی اس پر نظر تھی بابا۔ آج صبح میں چودھری کے یہاں گیا تو وہ بے وجہ مجھ پر گالیاں اور پتھر برسانے لگا۔ مجھے بھی تاؤ آگیا اور میں نے بھی جی کھول کر سنائیں۔ پھر وہ ٹھنڈا ہو کے مجھ سے معافی مانگنے لگا اور پوچھنے لگا، کیا میں جانگلو سے بھی گیا گذرا ہوں، بندھو؟ سچ سچ بتاؤ۔ اب میں اسے کیا بتاتا؟ آج وہ نئے کپڑے پہن کے اور جلیبیوں کی ٹوکری بھروا کے بے بے بشیراں کے پاس گیا ہے۔"

"ہہ ہہ ہاہہ!" کھوڈو بابا بھی کھلکھلا کر ہنس پڑا۔

"ہمیشہ اسی طرح خوب ہنسا کرو بابا۔" بندھو شادمانی میں دُم ہلانے لگا۔ "اس طرح مجھے بہت اچھے لگ رہے ہو۔"

بندھو نے دیکھا کہ ان کی سیدھ میں ہی کیکر کے نیچے ایک کالا ناگ بھی بابا کو دیکھ دیکھ کر آدھا اپنے بل کے اندر اور آدھا باہر خوشی سے بے اختیار ہل اور پھنکار رہا ہے۔

"اسے دیکھ کر تمہارا دَم کیوں خشک ہو گیا ہے؟ وہ بھی اپنا یار غار ہے کھوڈو۔" روٹی کا آخری لقمہ منہ میں ٹھونس کر بابا کھڑا ہو گیا۔ "آؤ تائی کو دیکھ آتے ہیں، وہیں پانی بھی پی لیں گے۔"

خوفزدہ بندھو بابا کو کوئی جواب دیے بغیر فوراً مُڑ گیا اور بابا کے آگے دوڑنے لگا۔

"آہستہ، کھوڈو!" بابا اس کی سرزنش کرنے لگا۔ "میرے ساتھ چلو۔"

"تمہارے اس یار غار کو دیکھ کر واقعی میرا دَم نکل گیا۔"

"اس کے باوجود چل پھر رہے ہو --- حق!"

بندھو نے سر موڑ کر کیکر کے درخت سے فاصلے کا جائزہ لیا اور کچھ یاد آنے پر کھڑا ہو گیا۔ "ہماری جھونپڑپٹی میں ایک بڑی نیک کرسٹانی عورت ہے بابا، روزی مدر، شام کو اس کے دھندے کا ٹائم ہوتا ہے، اس لیے وہ کل دن میں کسی وقت تم سے ملنے آئے گی۔"

"کیا دھندا کرتی ہے؟"

"جسم بیچنے کا۔"

آگے آگے دوڑنے کی نیت سے بندھو نے سر موڑا تو بابا نے اُسے پھر تنبیہ کی۔

"آہستہ!"

"مجھ سے آہستہ نہیں چلا جاتا، بابا۔" بندھو نے دوڑ لگانے سے پہلے اسے جواب دیا۔ "تم آہستہ آہستہ آؤ۔ میں جا کے تائی کو بتاتا ہوں۔"

(٦)

دوسرے روز روزی مدر بابا کے چبوترے پر آئی تو آتے ہی اس نے اپنے تھیلے سے دو سیب نکال کر بابا کو پیش کیے جنہیں ہاتھوں میں لے کر بابا نے لوٹا دیا۔ "یہاں سے جاتے ہوئے یہ سیب کھوڈو تائی کو دے دینا۔"

"کھوڈو تائی کون؟" مدر نے ہنس کر پوچھا۔ "اچھا اچھا! اپنا تائی کوراں۔ کوئی لفڑا نہیں، ہم دے دیتا۔" پھر اس نے تھیلے سے ولایتی شراب کی ایک بوتل نکالی۔ "یہ تائی کوراں نہیں لے گا۔"

"حق!" بابا کا چہرہ غصّے سے جلالی ہونے لگا۔

مدر نے جلدی سے شراب کی بوتل کو واپس تھیلے میں ڈال لیا اور ڈر جانے کے باوجود آواز میں خفگی بھر کے بولی "کیا تم سمجھتا ہے بابا، ہم کو اپنے اُلٹے سیدھے دھندے اچھا لگتا ہے؟ پر ہم یہ دھندے نہ کرے تو اور کیا کرے؟ تم کھدا کا آدمی ہے بابا، تم سے کیا پردہ؟" وہ بے جھجک بولنے لگی تھی۔ "تم سوچو میری اُمر میں جسم گراہک کو سونپا جاتا ہے یا گاڈ آل مائٹی کو؟ بولو، بابا! کبھی کوئی کڑک جوان گراہک پھنس جاتا ہے تو میں اس کے باجوؤں میں اپنا بیٹا یاد کر کے رونے لگتا ہے۔" اس کے لہجے میں ملتجیانہ اصرار تھا۔ "جب میں کھد آپ ہی اپنے آپ سے نفرت کرتا ہے تو تم کاہے کو کرتا ہے بابا؟"

مدر کے بے تامل اعتراف سے بابا ڈھیلا پڑ چکا تھا۔ "بولو، مجھ سے تمہیں کیا چاہیے؟"

"اور کیا چاہیے؟ ہم نے پتہ چلا ہے تمہارے بلانے پر مَرے ہوئے لوگ واپس چلا آتا ہے۔" مدر کی آنکھیں چھلکنے لگیں۔

"ہم کاوِکی بیٹا شراب پی پی کر کھدا کا پیارا ہو گیا تھا۔ ہمیں ہمارا وِکی سے بس ایک بار ملا دو۔"

کھوڈو بابا کو محسوس ہوا کہ اس کے سینے میں بھی مدر کا دل ہی دھڑکنے لگا ہے۔ "ملا دوں گا۔ حق!---ضرور ملا دوں گا۔"

مدر ڈانواں ڈول ہونے لگی کہ بابا انہیں کیوں کر ملائے گا۔ "ہمارے وکی کا مَرے پورا ایک برس بیت گیا ہے بابا۔"

"تو کیا ہوا، مدر؟ غریب آدمی کے مرنے سے اس کی جان تھوڑا ہی چھوٹ جاتی ہے۔"

(۷)

آج شام کو تو جھونپڑپٹی کے تقریباً سبھی لوگ بابا کے چبوترے پر اُمنڈ آئے تھے اور نہ صرف قبرستان کی اِس جانب بلکہ اُس جانب بھی قبرستان کا سارا کنارہ گھیر کر بیٹھ گئے تھے۔ کیا معلوم، قبرستان کے مُردے بیچارے کہاں اپنی جگہ بنا کر بیٹھے تھے؟

کھوڈو بابا پہلے روز کے مانند چبوترے کے سرہانے جوڑی ہوئی اینٹوں پر اپنی پیٹھ ٹکائے نیم دراز ہو کے بے جنبش پڑا تھا اور اپنی پھٹی ہوئی آنکھوں کو آکاش میں کھُبائے ایسے لگ رہا تھا جیسے اپنی قبر سے نکل کر وہیں اپنی مٹی پر ڈھیر ہو کے اپنی تلاش میں آسمان میں پہنچا ہوا ہے۔

سبھی لوگ بابا کے گُن گا رہے تھے اور ان کے کان کھڑے تھے کہ اور گھڑی دو گھڑی میں جونہی اس کی صدائے حق سنائی دے گی وہ اسی وقت ہمہ تن گوش اس کی طرف متوجہ ہو جائیں گے۔

پنڈت مُرلی دھر نے تو اسے اس طرح ڈوبے ہوئے پا کر عقیدت مندی سے اپنی چوٹی کی ساری گانٹھیں کھول لیں۔ "میں نے بہت فقیر اور مہاتما دیکھے ہیں چودھری۔" وہ رکھے چودھری کی بغل میں بیٹھا تھا۔ "پر اپنا بابا کھوڈو تو دُور---بہت دُور تک پہنچا ہوا ہے۔"

"تبھی اسے واپسی میں دیر ہوں رہی ہے۔" رکھے چودھری کو الجھن ہو رہی تھی کہ کھوڈو بابا اب آکاش سے پلٹ کیوں نہیں آتا۔

"سنو۔" پنڈت نے چودھری کو ٹھوکا دیا۔ "کوئی ہنسا ہے۔"

"تو کیاں ہواں پنڈت؟ ہنسنے والا کیاں تم سے پاٹھ پوجاں کرائے بغیر نہیں ہنس سکتاں؟"

"نہیں، چودھری۔" پنڈت نے اپنی بات پر زور دینے کے لیے آواز کو دبا کر کہا--- "میرا مطلب اِدھر والوں سے نہیں --- سنو، پھر کوئی ہنسا ہے اُدھر والوں سے۔" اس نے قبرستان کی طرف اشارہ کیا۔

"تو کیاں ہواں۔" چودھری نے بابا کا لہجہ اختیار کر کے کہا۔ "کوئی اِدھر کاں ہوں یا اُدھر کاں، خدا کی ساری مخلوق برابر ہے۔"

"لو، بابا نے ہلنا تو شروع کر دیا ہے۔"

چودھری نے فوراً بابا کی طرف دیکھا۔ "وہ تو مکھی ہے جوں باباں کے منہ پر ہل رہی ہے۔" وہ مکھی اُڑانے کے لیے اپنی جگہ سے اٹھ کر بابا کے پاس آیا۔ "اوں مور کھوں۔" سب چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگے۔ "باباں یہاں کہاں ہے؟"

"ہمارے سامنے کون پڑا ہے؟" پنڈت نے پوچھا۔

"باباتوں کوچ کر چکاں ہے۔"

"واہوں! --- ہوں!" بندھو بھی بھونک بھونک کر چودھری کے پاس آ کھڑا ہوا۔ "وہوں!"

"گھبراؤ نہیں۔" سب سراسیمہ ہو کر اُٹھنے لگے تو پنڈت انہیں سمجھانے لگا۔ "جہاں بھی گیا ہے، وہاں سے اور تھوڑی دیر میں لوٹ آئے گا۔" اسے پھر لگا جیسے کئی مردوں نے قہقہہ لگایا ہے اور وہ بوکھلا کر بول اٹھا۔

"دھیان سے دیکھو، چودھری، بابا کہیں چل تو نہیں بسا؟"

"ہاں، شیداں۔" ہرنی اپنی پڑوسن کو بتا رہی تھی۔ "پیل پھکبل اُدھل نہیں ہوتے جدھل ہوتے ہیں۔ کیا؟ کیا پتہ کھدا کے بندے بدن سے نکل کر کِدھل پہنچے ہوتے ہیں۔" اوروں کو بھی اپنی طرف متوجہ پاکر وہ اپنی بات میں بہتی چلی گئی۔ "میں اپنا مکابلہ بابا سے نہیں کل لئی۔ کہاں بابا اول کہاں میں مہامولکھ۔ کیا؟ میں نے کئی بال ماسوس کیا ہے، میلی جان تو اِدھل چوہدلی کی جھونپڑپٹی میں اٹکی ہوتی ہے۔ اول میں اپنی ماں کے آنگن میں اَڈی ٹپا کھیل لئی ہوتی ہوں۔ کیا؟ ---اب بتاؤ، میں ہوتی کدھل ہوں؟ مجھے اپنی تلب ہونے لگے تو کھد کو کہاں ڈھونڈوں؟"

"وہوں!---" بندھو سب کی طرف منہ لٹکا کر بھونک رہا تھا۔ "آرام سے بیٹھے رہو۔ واہوں!---"

"میں تو کہوں ہرنی۔" شیداں بول رہی تھی۔ "بابا جب گھومتے پھرتے اِدھر آن نکلا تھا، اس وکھت کیا پتہ وہ اسی تراں کدھر پڑا ہوگا؟"

"واہوں!" بندھو ان سب کو مخاطب کرنے کے لیے کھوذو بابا کے پہلو میں چبوترے پر آ کھڑا ہوا تھا۔ "پہلے تو بابا اپنے ٹھکانے کی کھوج میں گھومتا پھرتا تھا۔ واہوں! اب اسے کہاں جانا ہے۔ وہوں!---وہ اب سدا کے لیے یہیں بس گیا ہے---واہوں! واہوں!" □□

جیلانی بانو

جیلانی بانو ۱۶؍ جولائی ۱۹۳۶ء کو بدایوں (یوپی) میں پیدا ہوئیں۔ افسانہ نگاری کا آغاز ۱۹۵۵ء سے ہوا۔ ان کی ادبی تحریروں میں نو افسانوی مجموعے، دو ناولٹ اور دو ناول شامل ہیں۔ ان کا ناول "بارش سنگ" ہندی اور انگریزی زبانوں میں بھی شائع ہو چکا ہے۔ اس کے علاوہ افسانوں کے ترجمے بیشتر ہندوستانی اور غیر ملکی زبانوں میں چھپ چکے ہیں۔ انہیں غالب ایوارڈ (۱۹۷۸ء)، دوشیزہ ایوارڈ، کراچی (۱۹۸۳ء)، نہرو ایوارڈ، سوویت لینڈ (۱۹۸۵ء)، نقوش ایوارڈ، لاہور (۱۹۹۱ء) سے نوازا گیا۔ جیلانی بانو نے ٹیلی ویژن کے لیے ثقافتی اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور ہندوستان میں اُبھرتی ہوئی نئی عورت کے موضوعات پر سیریل بھی لکھے۔ جیلانی بانو کا افسانہ "جوائے" ان کی ادھر کی کہانیوں میں سے ہے۔

جوائے

جیلانی بانو

جوائے مقناطیس کا ایسا ٹکڑا تھا جس پر گھر کے بکھرے ہوئے سب ذرّے چمٹ جاتے تھے۔

''بھوں --- بھوں --- بھوں ---'' اس گھر میں صبح پر یقین جوائے کی آواز سے آتا ہے۔

میرا گھر --- جہاں سب ایک دوسرے سے منہ پھیر کر جی رہے تھے، ایک دوسرے کا جی جلا کر اپنا جی خوش کرتے تھے، باہر ملنے والی ساری ناکامیوں، ناانصافیوں کا انتقام، ایک دوسرے سے لیتے تھے۔

مگر جوائے انہیں کچھ کرنے بھی دے۔ اب تو صرف گھر میں جوائے کی مرضی چلتی ہے۔ کسی کو پیار آتا ہے تو جوائے پر --- ہنسی آتی ہے تو جوائے کی

حرکتوں پر ---اس کا موڈ، اس کی محبت، اس کی پسند ناپسند ---کبھی کبھی مجھے ایسا لگتا ہے جیسے صدر خاندان کی کرسی پر میری بجائے جوائے بیٹھا ہو اس گھر میں۔ جوائے ہر کام کی نگرانی کرتا ہے۔ باہر جانے والوں کو گیٹ تک چھوڑتا ہے۔ اندر آنے والوں کو پہلے شک و شبہ سے دیکھتا ہے اور پھر ان کے کردار کے بارے میں پوری طرح مطمئن ہونے کے بعد ہی انہیں اندر آنے کی اجازت دیتا ہے۔ پھر کچن کی نگرانی کرتا ہے، دیواروں سے جھانکنے والی بلیاں، درختوں پر شور مچانے والے کوے اور دروازے پر بیل بجانے والے اجنبی چہروں سے نپٹنے میں وہ خوب تھک جاتا ہے۔

''بھوں --- بھوں --- بھوں--- اٹھو اٹھو---'' وہ اجالا ہونے سے پہلے مجھے جھنجھوڑ ڈالتا ہے۔ ''کوئی اچھا خواب تو تمہارے نصیبوں میں ہے نہیں، تو پھر چلو۔ نیچے سڑک پر کوئی خوبصورت خیال، خوبصورت دلچسپ حادثہ ڈھونڈیں۔''

'اونہہ ---'میں اپنے چہرے پر جوائے کے پیار کی نمی پونچھ کر کروٹ بدل لیتا ہوں۔

'کوں---کوں---کوں---'جوائے اب میرے بستر پر آگیا ہے۔

میری بیوی رما نیند کی گولی کھا کر سوتی ہے اور جوائے یہ بات جانتا ہے کہ اس جرأت پر اس وقت وہ رما کی لات نہیں کھائے گا۔

'تو دروازہ کھول کر اندر کیسے آجاتا ہے---؟'میں اس کی گردن پکڑ کر نیچے دھکیل دیتا ہوں۔ ہم دونوں سونے سے پہلے اپنے اپنے موسم بدلتے رہتے ہیں۔ کبھی مجھے گرمی لگتی ہے، کبھی رما کو سردی۔ پھر دن بھر کے شکوے شکایتیں۔ ایک دوسرے پر الزاموں کی بوچھار اور ان سے بچنے کے لیے کرنٹ والے تار ہم نے اپنے چاروں طرف پھیلا رکھے ہیں۔ جب میں رما کی طرف بڑھتا ہوں تو کتنے سوئچ آن اور آف کرنا پڑتے ہیں۔

مگر جوائے انہیں ایک ہی چھلانگ میں پار کر کے مجھے پیار کرنے آجاتا ہے۔ اس ادا پر اس کا منہ نہ چومیں تو کیا کریں۔

مگر اس کے بعد رما کی نفرت بھری چھی چھی --- تھو تھو---

اور تھوڑی دیر بعد جب رما بستر پر بیٹھی جمائیاں لیتی ہے تو جوائے اس کی گود میں چڑھ کر بھی اپنا پیار وصول کر لیتا ہے اور چوری پکڑے جانے پر وہ ایسے سر جھکا لیتی ہے جیسے میں نے اسے کسی عاشق کے ساتھ رنگے ہاتھوں پکڑ لیا ہو۔

میں ایک ناکام بزنس مین ہوں۔ بیوپار میں گھاٹا میرا بلڈ پریشر بڑھا دیتا ہے۔ مگر صبح ٹی وی پر بڑھتی ہوئی قیمتوں کا نشان مجھے پرسکون کر دیتا ہے۔ ایسے وقت انسان کا جی چاہتا ہے آنکھیں بند کیے راتوں رات لکھ پتی بننے کا خواب دیکھے۔

لیکن ڈاکٹر نے مجھے صبح سویرے چلنے کا حکم دیا ہے۔ اور یہ بات سب بھول جائیں جوائے نہیں بھولتا۔ سڑک پر آنے کے بعد میرے ہاتھ میں جوائے کی زنجیر ہوتی ہے مگر جوائے تو جیسے زنجیر میرے گلے میں ڈال کر من مانے راستوں کی اور چل نکلتا ہے۔

چار منزلوں کی سیڑھیاں اترنے کے بعد میرا جی چاہتا ہے لان کی بنچ پر ہی بیٹھا رہوں۔ مگر جوائے کے لیے تو صبح کے اُجالے میں بے شمار وعدے اور امیدیں جگمگاتی ہیں۔ رات کو اس راہ سے گذرنے والی کتیاں یہاں اپنی خوشبو بکھیر گئی ہیں۔ جوائے اپنے نتھنے پھیلا کر منہ اٹھا کر ہوا میں کچھ سونگھتا ہے اور انجانی راہوں پر بھاگنے لگتا ہے۔ کبھی کبھی بزنس کے دَم گھونٹ دینے والے پھندوں سے جان چھڑا کر میرا جی چاہتا ہے میں ایک نظم لکھوں۔ کھلی ہوا میں بیٹھ کر کسی نئے خیال کو پکڑوں۔

مگر جوائے بھی ایک خواب دیکھنے والا آرٹسٹ ہے جو اپنی نئی تخلیق کی کھوج میں آگے دوڑنا چاہتا ہے۔ کبھی میں آگے آگے چلتا ہوں اور جوائے ایک سعادت مند بچے کی طرح ساتھ ساتھ میرے موڈ کو دیکھتے ہوئے چلتا ہے۔ پھر اچانک سڑک کا کوئی نظارہ اسے دوڑنے پر مجبور کر دیتا ہے اور میں اس کے پیچھے پیچھے بھاگتے ہانپ جاتا ہوں۔ میں ایک ناکام بزنس مین، معمولی سا شاعر --- ساری زندگی اونچا اڑنے کے خواب دیکھتا رہا۔

"ڈیڈی --- آپ نے بزنس کی لائن اپنانے سے پہلے کسی سے مشورہ نہیں کیا؟"

"ڈیڈی آپ کے کلاس فیلو کتنے مشہور ڈاکٹر ہیں۔ آپ نے میڈیسن میں ایڈمیشن کی

کوشش کیوں نہیں کی؟"

اپنے بچوں کے ایسے سوالوں پر میں گھبرا جاتا ہوں۔

"ارے انہوں نے تو زندگی بھر جس سودے میں ہاتھ ڈالا گھاٹا ہی گھاٹا۔" رما ٹھنڈی سانس بھر کے اپنا ماتھا پیٹ لیتی ہے۔

اور مجھے چاروں طرف دُھواں ہی دھواں نظر آتا ہے۔

رما جتنی سندر تھی اُتنی ہی کڑوی۔ شیرہ ٹپکاتی گلاب جامن جیسی اس موہنی سی لڑکی پر میں اپنا سب کچھ لٹا بیٹھا تھا۔ پھر جس دن اپنے گرہ میں اس کا پلّو باندھ کر میں اپنے گھر کی سیڑھیاں چڑھا تھا تو جیسے کسی پہاڑ پر چڑھتا گیا۔ رما مجھ سے دور ہی دور کھڑی ہنستی رہی۔ اس نے میرے گلے میں ایک رسّی ڈال کر ڈگڈگی بجادی تھی۔

اب میں جوائے کے گلے میں رسّی ڈال کر بھاگ رہا ہوں۔ ہم دونوں ہانپ رہے ہیں۔ میں جانتا ہوں وہ جس راستے پر جارہا ہے وہاں آگے کچھ نہیں ہے۔ مگر کھوج اور کسی انہونی خوشی سے مڈ بھیڑ اسے دیوانہ بنائے رکھتی ہے۔ وہ قریب سے گذرنے والے لوگوں، کاروں اور اسکوٹروں کو بڑے غور سے دیکھتا ہے اور پسند نہ آنے والے چہروں پر بھونکنے لگتا ہے۔

"ارے احمق یہ تو کسی منسٹر کی کار تھی۔ تجھے کیا ضروری تھا اس پر بھونکنا؟"

یہ سن کر جوائے رکا اور پاس والے کھمبے کی طرف ٹانگ اٹھا کر پیشاب کرنے کی ایکٹنگ کی۔ اس سے پہلے وہ ہر پسند نہ آنے والے چہرے کو دیکھ کر یہی کام کرتا رہا ہے۔

اب آسمان پر وہم کی طرح نظر آنے والا اُجالا آنے والے دن کا یقین بن کر پھیل رہا ہے۔

وہ ابھی تک نہیں آئی۔ ہم دونوں ایک ساتھ دور تک دیکھتے ہیں۔

رات کو وہ اس راہ سے گزری تھی۔ نتھنے چوڑے کر کے جوائے اس کی خوشبو سونگھتا ہے۔ پھر اچانک دُور سے آنے والی روزی کی بھوں بھوں اسے روک دیتی ہے۔ وہ منہ اوپر اٹھا کر "آشیانہ" مکینوں سے کہتا ہے "بھوں۔ بھوں۔ بھوں--- چھوڑ دو روزی کو سلاخوں کے

پیچھے مت بند کرو۔ روزی ڈیر نیچے آؤ۔"

"نرا احمق ہے تو---" مجھے غصہ آجاتا ہے۔ وہ تو بند دروازوں کے پیچھے قید ہے۔ اس کی موٹی مالکن کو ٹہلنے کے نام سے چڑ ہے۔ اس لیے وہ اپنی نازک اندام کنواری کتیا کو عاشق مزاج کتوں سے دور رکھتی ہے۔ سلاخوں والی کھڑکی کے پیچھے بٹھادیتی ہے کہ جوائے جیسے کتے بھونکتے بھونکتے بے حال ہو جائیں۔

چلاؤ مت یار۔

"وہ مل جائے گی تو اور پچھتاؤ گے بیٹا۔"

مگر جوائے اپنی محبتوں کے سراغ جانے کہاں کہاں کھوجتا پھرتا ہے۔ جگہ جگہ رُک کر وہ پنجوں سے زمین کھود ڈالتا ہے۔ اپنی منہ زور خواہشوں سے بے تاب ہو کر چھلانگیں لگاتا ہے۔ مجھے اکتاہٹ ہونے لگتی ہے۔ اس کے آگے ہی آگے دوڑتی ہوئی سڑک پر میرے لیے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ جوائے کی زنجیر تھام کر اس کے پیچھے پیچھے چلنا ہی میرا کام ہے۔

ڈاکٹر نے کہا ہے روز پانچ کلو میٹر چلنا چاہیے۔ اس فاصلے کو کئی بار میں نے دل میں ناپا۔ پٹرول پمپ سے آگے، آئس کریم پارلر کے پاس--- مگر جوائے کے لیے کوئی حد آتی ہی نہیں۔ روزی کے لیے چلاتے چلاتے ایک پرندے کا اڑتا ہوا پر اس کے لیے نئی خوشیوں کا سامان لے آیا--- وہ جی بھر کے اُچھلا کودا، غرایا اور پھر اس پَر کو منہ میں دبوچ کر میری گود میں ڈال دیا۔ جوائے کے لیے اس دنیا میں کتنی خوشیاں تھیں اور میں خالی ہاتھ گود میں رکھے، فٹ پاتھ پر بیٹھا ہوں۔

ایک عورت کی غصہ بھری نظریں اسے پھر آگے کی طرف دوڑانے لگتی ہیں۔ اپنے گلے میں پڑی ہوئی زنجیر کو وہ اب نہیں مانتا، جیسے زنجیر اس نے میرے گلے میں ڈال دی ہو۔ سڑک پر جتنی خوبصورت عورتیں جارہی ہیں، وہ جوائے کو دیکھ کر ہنستی ہیں۔ راستہ چلنے والے بچے اسے دیکھ کر سیٹی بجاتے ہیں۔ چمکیلی دھوپ اس کے لیے نکلی تھی۔ اسے ٹھنڈی ہوائیں مل رہی تھیں۔ مزیدار خوشبوئیں، انوکھے منظر، دلچسپ کھلونے۔

اور میرے ساتھ صرف تیز دھوپ ہے۔ آج آنے والے بزنس کی اُلجھنیں اور ہر پل زیادہ گرم پڑنے والا سورج۔

سڑک پر چہل قدمی کرنے والے سب لوگ جوائے کو وِش کرتے ہیں۔ کتے کے سر پر ہاتھ پھیرنا مہذب ہونے کی نشانی ہے اور مجھ جیسے فالتو آدمی سے سڑک پر بات کرنا اونچی سوسائٹی میں اچھا نہیں سمجھا جاتا۔ اس لیے جب جوائے میرے ساتھ ہو تو لوگوں کو وہ اکیلا ہی نظر آتا ہے اور جب میں سڑک پر اکیلا ہوں تو لوگ مجھے ایک آدمی کی طرح نظر انداز کر دیتے ہیں۔

ہم دونوں سر جھکائے اب گھر کی طرف چل رہے تھے کہ اچانک سڑک پر دور پنکی اپنی ماں کے ساتھ نظر آئی اور ہم دونوں کے دلوں کی کلی کھل اٹھی۔

''جوائے---جو---جو---جو---''

وہ سڑک پر ملے تو جوائے کے لیے سیٹیاں بجاتی ہے۔ جوائے اس کی آواز سنتے ہی بھاگتا ہوا پنکی کی گوری پنڈلیوں سے لپٹ جاتا ہے۔ اس کی فراک پکڑ کر جھولتا، اسے دھکے دے کر آس پاس منڈلاتا ہے۔ پنکی ہم دونوں کو پسندیدہ نظروں سے دیکھتی ہے۔ اس نے ایک بار ٹی وی پر میری نظم سنی تھی اور مجھ سے آٹوگراف لینے آئی تھی۔

پنکی کی مسکراہٹ کی ٹھنڈک اس کے قرب کی آنچ اس کی نظروں کی پسند میری تھکن بھی اتار دیتی ہے۔ کبھی کبھار جوائے سے کھیلنے کے بہانے پنکی ہمارے گھر بھی آنے لگی ہے۔ حالانکہ اس کی ماں سے لان خراب کرنے کے سلسلے میں رما کی زبردست جنگ ہو چکی ہے مگر وہ ارچنا کی سہیلی ہے اور دوستی کا بندھن اب جوائے سے بندھ گیا ہے۔ پڑوس کے سب بچے ہمارے گھر کو صرف جوائے کا گھر کہتے ہیں۔

پنکی کے گھر میں آتے ہی جوائے میری کرسی کے نیچے سے اُچھل کر اس کی طرف بڑھتا ہے۔ خوشی سے بھری 'کوں کوں' کے ساتھ اسے دھکیلنے لگتا ہے۔ پنکی اس کے لیے چاکلیٹ لاتی، یا چھوٹا سا بال اور ان دونوں کی اُچھل کود چیخ پکار سے سارا گھر گونج اٹھتا۔ جوائے کے ساتھ کھیلتے کھیلتے پنکی میرے کمرے میں آجاتی تو میں گھبرا کے کھڑا ہو جاتا تھا۔ اسے

دیکھتے ہی کوئی نہ کوئی بات ہو جاتی۔ میری کوئی چیز ضرور کھو جاتی تھی اور میں سارے کمرے کو اُلٹ پلٹ کر ڈالتا۔ تب جوائے میرے سامنے پھیلا ہوا اخبار سمیٹ کر ڈسٹ بن میں ڈال آتا ---سب ہنسنے لگتے۔

"اب یہ بہت ستانے لگا ہے پنکی۔" ارچنا بھی ان کے کھیل میں شریک ہو جاتی تھی۔

"جوائے کو جو چیز اچھی نہیں لگتی اسے ڈسٹ بن میں پھینک دیتا ہے۔" پنکی ہنسنے لگی۔

"سچی---؟"

"ہاں، ہماری کوئی چیز کھو جائے تو ڈسٹ بن میں مل جاتی ہے، پرسوں ممی کی لپ اسٹک۔"

"ارچنا، شور مت کرو--- میرے سر میں درد ہو رہا ہے۔" ممی کی ڈانٹ سن کر ان دونوں کی ہنسی تھم گئی۔

"بھوں۔ بھوں۔ بھوں" جوائے نے رما کو ڈانٹ دیا۔

"چپ رہو--- ہر وقت کی بک بک---"

رما کو جوائے پر غصہ تو بہت آیا پھر سب کے سامنے یوں ظاہر کیا جیسے جوائے کو جانور سمجھ کر معاف کر دیا ہے۔

میری ہنسی بڑی دیر تک نہ رکی۔ جوائے نے جیسے آج میری دلی مراد پوری کر دی ہو۔ رما کو کوئی ڈانٹ سکے۔ یہ کیسی انہونی بات تھی۔

ناشتے کی میز پر اخبار رکھا ہو گا۔

چاروں طرف دنیا میں گھمسان کا رن پڑا ہے۔ اخبار والی میز کے آس پاس بھی گھر کی بڑی طاقتوں کے درمیان شدید تضاد تھا۔ رومی نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ جائیداد میں سے اپنا حصہ لے کر امریکہ چلا جائے گا تاکہ ایسے احمق باپ اور ضدی ماں سے پیچھا چھڑا سکے۔ ارچنا اپنی پڑھائی چھوڑ کر اس اسٹیج اداکار سے شادی کرنے کا فیصلہ کر چکی تھی جو اب تک دو بیویوں کو چھوڑ چکا ہے۔ رما سمجھتی تھی اس گھر میں اس کے احکام نہ مانے جائیں، یہ ہو ہی نہیں سکتا۔ اس

کی اولاد کے بگڑنے کی ساری ذمہ داری ان کے باپ پر ہے جو اتنا مفلس اور اتنا بزدل ہے کہ اولاد پر کوئی رُعب ہی نہ ڈال سکا۔

کویت ایک چھوٹا سا ملک ہے جس پر راتوں رات ایک بڑی طاقت نے حملہ کر کے قبضہ کر لیا۔ اخبار کی یہ خبر بریڈ کی سلائسوں اور مارملیڈ کی مٹھاس میں کڑواہٹ گھول چکی ہے۔

رما اور بچوں کے ساتھ اس وقت بولنے والے ڈائیلاگس میں راستے بھر یاد کرتا رہا ہوں۔ ہمیں دروازے میں دیکھ کر سب سے پہلے رومی سیٹی بجاتا ہے۔ ''ہیلو جوائے، جو جو جو---''

اب جوائے میرے ہاتھ سے زنجیر کا سرا چھڑا کر رومی کی طرف اُچھلتا ہے۔ اس کی ٹانگوں سے لپٹ جاتا ہے۔ اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر جھنجھوڑ ڈالتا ہے۔ رومی بڑی محبت سے اس کے بال سہلاتا ہے۔ خوب مکھن لگا کر بڑے چاؤ سے اسے سلائس کھلاتا ہے اور پھر گھبرا کر مجھ سے پوچھتا ہے۔ ''ڈیڈی! آج تو شاید آپ کو جوائے کو انجکشن بھی دِلوانا ہے نا ---؟'' (یہ صرف ڈیڈی سے بات کرنے کا بہانہ ہے)

میں کوئی جواب نہیں دیتا، صرف سر ہلا دیتا ہوں (اس ڈائیلاگ کی مجھے امید نہیں تھی نا)

''اتنی دیر لگا دیتے ہو آنے میں۔'' رما بھی اُبلا ہوا انڈا توڑتے میں کچھ کہنا ضروری سمجھتی ہے۔

''ہمیں جلدی جانا ہے۔ اس لیے ہم نے ناشتہ شروع کر دیا۔'' ارچنا سر جھکا کر کہتی ہے۔

''صبح سویرے لوگ اندھا دھند کار چلاتے ہیں۔ ذرا دیکھ بھال کر لے جایا کرو جوائے کو۔''

کرسی پر بیٹھ کر میں اپنی پلیٹ کو سیدھا کرتا ہوں۔ جانے ڈاکٹر نے کل مجھے کیا پرہیز بتایا تھا۔

''بہت بھوکا ہے بیچارہ --- خوب تھک گیا ہے نا --- سنو پہلے جوائے کو دودھ دے دو۔'' ارچنا چاہتی ہے اس وقت سب جوائے کی بات کریں۔ اس کے بارے میں نہیں۔

ڈاکٹر نے مجھے ناشتے سے پہلے دو دوائیں کھانے کو کہا ہے مگر اتنا تھک گیا ہوں کہ بیڈ

روم سے دوائیں لانے کو جی نہیں چاہتا۔

"کیوں! آج پھر ناشتہ نہیں کرو گے---؟" رما بیزاری سے میری طرف دیکھتی ہے۔

"اچھا اچھا ابھی کھاتا ہوں۔"

"جوائے، جوائے---جوائے---" ارچنا جوائے سے کھیل رہی ہے۔ وہ ارچنا کو چھو چھو کر بھاگ رہا ہے۔ کبھی صوفوں پر اچھلتا ہے۔ کبھی اس کی ساری کا پلو پکڑ کے کھینچتا ہے۔

فون کی گھنٹی بجی---جوائے کھیلنا چھوڑ کر فون کی طرف منہ کر کے بھونکنے لگا۔ اسے فون آنے سے بڑی چڑ تھی۔ اتنی دیر اسے چپ رہنا پڑتا ہے نا۔

فون رومی کے لیے تھا---وہ اٹھا تو منہ پر انگلی رکھ کر جوائے سے کہا۔ "---چپ---چپ---"

جوائے چپ ہو گیا۔ مگر نچلا بیٹھنا اس کے بس میں نہ تھا۔ اس لیے چاروں طرف ایسی چیزیں ڈھونڈنے لگا جو اس کمرے میں اسے غیر ضروری لگ رہی تھیں۔ اس نے پہلے ارچنا کی کتاب صوفے سے اٹھا کر ڈسٹ بن میں ڈالی۔ پھر میری دوا کا پیکٹ، رما کے بالوں سے گرتے پھول!

"جوائے اسے بھی ڈسٹ بن میں ڈالو۔" میں گھبرا گیا۔ ارچنا نے میری طرف اشارہ کیا تھا--- نہیں۔

میرے پیروں کے پاس چھوٹا سا سلائیس پڑا تھا۔

"آپ ناشتہ کیوں نہیں کرتے۔" رما بیزار ہوتی جا رہی تھی۔

"ہاں، کرتا ہوں۔ پہلے دوا کھانا ہے۔"

"اتنی دوائیں کھا کھا کے ہاضمہ خراب کر لیا ہے۔" وہ منہ بنا کر میز سے اٹھ جاتی ہے۔

سلائیس پھینکنے کے بعد جوائے نے رومی کا سگریٹ کیس منہ میں دبایا اور ڈسٹ بن کی طرف بڑھا۔ مگر فون رکھ کر اس نے جوائے کے منہ سے سگریٹ کیس چھینا۔ ایک تھپڑ اس کے منہ پر لگایا اور ایک فحش گالی دی۔ "میری کسی چیز کو ہاتھ لگایا تو مار کے اسی ڈسٹ بن میں

پھینک دوں گا۔"

مار کھا کے جوائے چکرا گیا--- گالی سن کر سہم گیا--- لڑکھڑاتا ہوا وہ میری طرف آیا اور میرے قدموں کے پاس بیٹھ کر ہانپنے لگا۔

جوائے کے پٹنے پر رما تلملا سی گئی۔ مگر غصے میں بھرے بیٹے کے سامنے منہ کھولنے کی ہمت نہ پڑی۔

"وہ گالی برداشت نہیں کرسکتا۔" ارچنا کو بھی جوائے کا پٹنا اچھا نہ لگا۔ "ہاں اسے توڈانٹ دو تب شرمندہ ہو جاتا ہے۔" ارچنا نے اپنا پرس اٹھا کر باہر جاتے ہوئے کہا--- "وہ بھی کوئی انسان ہے کہ مارنے لگے؟"

جوائے کے مزاج سے اس گھر میں سب اچھی طرح واقف تھے۔ اس کی تکلیف پر سب کو دکھ ہوتا ہے۔ جوائے تم لکی ہو۔

گھر سے باہر جاتے وقت گھر کا ہر فرد بڑی دیر تک آئینے کے سامنے کھڑا رہتا ہے۔ سب اپنے چہروں پر دوسرا ماسک چڑھاتے ہیں۔ ہنستے مسکراتے، دنیا کو اپنانے اور اپنی چالاکی کو کیش کرانے کے لیے اچھا میک اَپ اور اچھی ایکٹنگ ضروری ہو گئی ہے۔

"جو--- جو--- جو---" باہر جاتے وقت رومی نے روٹھے ہوئے جوائے کو منانا ضروری سمجھا اور اس کی آواز سنتے ہی اُچھل کر دوڑنا اور رومی کی ٹانگوں سے لپٹ جانا ضروری تھا۔ اور جب تک رومی کی کار گیٹ سے باہر نہ چلی جاتی وہ چلا چلا کر اُچھلتا رہتا تھا۔ مگر آج اس نے ذرا سی آنکھ کھول کر رومی کو دیکھا اور منہ پھیر کر لیٹ گیا۔

مجھے شک ہونے لگا۔ جوائے میں کسی انسان کی روح آرہی ہے۔ وہ دھیرے دھیرے انسانوں جیسا بن رہا ہے۔ اگر سچ مچ ایسا ہو گیا تو--- کسی ڈسٹ بن میں پھینک دیے جاؤ گے!

اخبار پڑھتے پڑھتے مجھے اونگھ سی آنے لگی۔

میں کھانے کی میز کے نیچے پڑا رومی کی مار سے کراہ رہا تھا--- میرے گلے میں ایک زنجیر پڑی تھی جسے جوائے گھسیٹ رہا تھا۔

"کیسی بے دردی سے گھسیٹتے ہو اسے ---؟" رما جوائے سے کہہ رہی تھی --- "آؤ، میری گود میں آؤ---"

میں کود کر رما کی گود میں جا بیٹھا---اور جب رما نے اپنا محبت بھرا ہاتھ میرے بالوں پر پھیرا تو میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

جانے کون رو رہا تھا---میں---؟یا وہ---؟□□

زاھــــدہ حِــــنا

زاہدہ حنا ۱۹۴۶ میں بہار کے تاریخی شہر سہسرام میں پیدا ہوئیں۔ سولہ برس کی عمر سے ادب اور صحافت سے وابستہ ہیں۔ گذشتہ دس برس سے روزنامہ "جنگ" کی مستقل کالم نگار ہیں۔ کئی اہم اور مشہور پرچوں کی مدیر رہی ہیں۔ بی۔ بی۔ سی۔ اردو سروس سے وابستہ رہیں اور وائس آف امریکہ اور ریڈیو پاکستان کے لیے بھی کام کیا۔ زاہدہ حنا ٹیلی ویژن کے لیے ڈرامے بھی لکھتی ہیں۔ "قیدی سانس لیتا ہے" اور "راہ میں اجل ہے" ان کے افسانوی مجموعوں کے نام ہیں۔ برصغیر کی تقسیم کے موضوع پر ان کا ناولٹ "نہ جنوں رہا نہ پری رہی" شائع ہوا۔ ان کی کہانیاں اردو اور انگریزی کے متعدد انتخابات میں چھپ چکی ہیں اور ہندی، سندھی، گورمکھی، مراٹھی اور بنگلہ میں بھی ترجمہ ہوئی ہیں۔ انہیں ادبی اور سماجی خدمات کی بناو پر مختلف ایوارڈ مل چکے ہیں۔ "پانیوں میں سراب" ان کے افسانوی مجموعے "قیدی سانس لیتا ہے" (۱۹۸۳ء) میں شامل ہے۔

پانیوں میں سراب

زاہدہ حنا

لوحِ مزار پر ''عصمت پناہ'' پڑھ کر میں بے ساختہ ہنسی اور میں نے اظفر سے کہا۔ ''میری قبر پر بھی 'عصمت پناہ' کندہ کروا دینا۔''

اظفر بے معنی سے انداز میں مسکرایا اور ہم قبروں کے درمیان سے گزرتے ہوئے باہر آگئے۔ گاڑی روانہ ہوئی تو احسن نے اچانک 'عصمت پناہ' کی ترکیب کا ذکر چھیڑ دیا اور بات نظریۂ عصمت اور تاریخ کے مختلف ادوار میں عصمت کے معیار تک پہنچی۔ الف لیلہ کا شہریار، بے وفا شہزادیاں اور ان کی خلوتوں میں بار پانے والے حبشی غلام، بغداد کے گلی کوچے، نیپلز اور فلورنس کی حویلیاں اور باغات، 'ڈی کیمرون' کی پامپینا، نی فیتی اور

میڈیلینی، دل ہتھیلی پر رکھ کر پھرنے والے عشاق اور شوہروں کے پیٹھ پھیرتے ہی خواب گاہوں کے در کھول دینے والی نازنینیں۔

میں نے موضوع بدلنا چاہا لیکن بات سے بات نکلتی چلی گئی اور پھر اس نکتے پر بحث ہونے لگی کہ عصمت و عفت کا تصور مطلق ہے یا اضافی؟ درمیان میں لطیفے اور چٹکلے بھی بیان ہو رہے تھے اور پھر Chastity Belt کا ذکر نکل آیا۔

احسن نے فوراً ہی صلیبی جنگ پر جانے والے ایک ایسے مسیحی سورما کا قصہ چھیڑ دیا جس نے جنگ پر روانگی سے پہلے اپنی بیوی کو Chastity Belt پہنوائی اور چابی اپنے عزیز ترین دوست کے حوالے کر گیا۔ اصولی طور پر چابی اسے اپنے ساتھ لے جانی چاہیے تھی لیکن وہ ایک منصف مزاج آدمی تھا اور اسی لیے اس نے چابی دوست کے حوالے کر دی تھی کہ اگر وہ جنگ میں مارا جائے تو چابی اس کی بیوی کے سپرد کر دی جائے تاکہ وہ جس سے چاہے شادی کر سکے۔ ابھی وہ سورما کچھ ہی دور گیا تھا کہ اس کا دوست گھوڑا سرپٹ دوڑاتا ہوا اس کے پاس پہنچا اور کہنے لگا "تم مجھے غلطی سے کوئی دوسری چابی دے آئے ہو، یہ Chastity Belt کی چابی تو نہیں ہے۔"

ایک قصہ کسی شہزادی کا تھا جس نے اپنے محبوب شوہر کی جنگ پر روانگی سے پہلے Chastity Belt پہن کر چابی شوہر کے سامنے ہی ایک تالاب میں پھینک دی تھی۔ کچھ دنوں بعد جب وہ کسی دوسرے مرد کے عشق میں گرفتار ہوئی تو اس نے اپنی ساری دولت ان غوطہ خوروں کو دے ڈالی جو تلاش بسیار کے باوجود چابی کی تلاش میں ناکام رہے تھے۔ یہ اور اسی قسم کے دوسرے قصے اس وقت تک بیان ہوتے رہے جب تک کہ ہم کنجھر جھیل نہ پہنچ گئے۔

اور اب ہم پانیوں پر تھے۔ سونا لٹاتی دھوپ جھیل کے پگھلے کانچ جیسے سبز پانی پر بچھی تھی۔ تہہ میں آبی پودے لہروں کے ساتھ ہلکورے لے رہے تھے اور سبز کائی ان سے لپٹی ہوئی تھی۔ جل کوّوں کی ایک ڈار پھڑ پھڑاتی اتری اور پانیوں پر سفر کرنے لگی۔ کشتی آگے بڑھ رہی تھی، زمینی منظر دور ہوتے جا رہے تھے۔ پیڑ، ان پیڑوں کے سائے میں بیٹھے انسان، بڑے بڑے ٹرک جو جھیل کے کنارے نہایت مستعدی سے دھوئے جا رہے تھے، اب دوری کے سبب

ہیولے لگ رہے تھے۔

میرے عقب میں آواز ہوئی تو میں نے گردن گھما کر دیکھا۔ کنارے کے قریب اظفر نے ایک مچھلی پکڑی تھی اور اب وہی کشتی کے فرش پر تڑپ رہی تھی۔ یہ اسی کے تڑپنے پھڑکنے کی آواز تھی۔

"اظفر پلیز، اسے پانی میں پھینک دو۔" میں نے بیتابی سے کہا۔

"بمشکل تمام ایک تو ہاتھ آئی ہے اور تم کہہ رہی ہو کہ اسے واپس پھینک دوں، جواب نہیں ہے تمہارا بھی۔" اظفر کی آنکھوں میں مچھلی کو تڑپتے دیکھ کر لذّت کی ایک لکیر کھنچ گئی۔ میں نے اپنے سامنے بیٹھے یوسف کی طرف دیکھا اور اس نے اپنی نگاہیں جھکا لیں۔

صفیہ احسن نے تھرماس کھول کر مگوں میں کافی اُنڈیلنی شروع کی اور میں نہ چاہتے ہوئے بھی اس کا ہاتھ بٹانے لگی۔ سموسے ٹھنڈے ہوگئے تھے لیکن گرما گرم کافی کے ساتھ وہ بھی لطف دے رہے تھے۔

کافی گھونٹ گھونٹ کر کے پیے جانے کے لیے ہے۔ سموسے لقمہ لقمہ کر کے کھائے جانے کے لیے ہیں۔ اور میں اس لیے ہوں کہ دن میں ہجر کا عذاب مجھے پانی کرے اور میں اس لیے ہوں کہ رات آئے تو میرے مجازی خدا کے بدن کی سرشاری کا گدھ میرے وجود کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے کھائے۔ مجھ سے اچھی تو یہ کافی ٹھہری جو ایک لمحے میں پی لی جاتی ہے اور معدوم ہو جاتی ہے، مجھ سے بہتر تو سموسے کا یہ لقمہ ہے جسے صرف ایک مرتبہ چبایا جاتا ہے اور پھر نجات پا لیتا ہے۔ ہر رات مجھے چباتی ہے اور میں ختم نہیں ہوتی۔ ہر دن مجھے پیتا ہے اور میں موجود رہتی ہوں۔

کافی پیتے ہوئے احسن نے گنگنانا شروع کر دیا "اکیلے مت جیو رادھے جمنا کے تیر۔" میں نے لرز کر اسے دیکھا۔ تم دلوں کے بھید کس طرح جانتے ہو، سنا ہے دلوں کا بھید تو بس خدا جانتا ہے اور کون جانے کہ جاننے یا نہ جاننے کے مرتبے پر فائز موجود ہے یا معدوم۔

احسن کی آواز پانیوں پر بگولے کی طرح چکراتی ہوئی اٹھی۔ "اکیلے مت جیو رادھے، اکیلے

مت جھپو رادھے۔" کنہر جھیل کا پانی اترنے لگا۔ زمین کی گہرائیوں میں سمانے لگا اور آنکھ کی پتلی پر جمنا کا گہرا سبز پانی پھیل گیا، گہرائیوں میں اترتا ہوا، وسعتوں میں پھیلا ہوا۔

میں اکیلی تو نہ گئی تھی، میں تنہا تو نہ گئی تھی۔ مجھے تو خود اظفر تنہا چھوڑ گیا تھا--- بمبئی میں کئی لوگوں سے ملاقاتیں ضروری تھیں ورنہ جس بزنس ٹور پر وہ گیا تھا، وہ ناکام ہو جاتا۔ وہ دو دن کے لیے گیا تھا پھر اس کا فون آیا کہ اسے ابھی دو دن اور لگیں گے۔

میں اور یوسف دلّی میں گھومتے رہے، میں اس سے اظفر کی بے اعتنائیوں کا ذکر کرتی رہی اور وہ سنتا رہا۔ میں نے اسے کہا صرف روپیہ ہی تو کوئی چیز نہیں ہوتا، سب سے بڑی چیز محبت ہے، دوسرا ہت ہے جس کے لیے اظفر کے پاس وقت نہیں ہے۔ بیوی، بچے اور رشتہ دار یہ سب ثانوی چیزیں ہیں۔ اصل مسئلہ روپیہ ہے اور مزید روپیہ۔

میرا ذہنی سفر خوابوں سے شروع ہو کر کتابوں پر ختم ہوتا تھا۔ روپے سے کتابیں تو خریدی جاسکتی تھیں لیکن خواب کسی بازار میں نہیں بکتے تھے اور سکۂ رائج الوقت سے خریدے نہیں جاسکتے تھے۔ پھر میں اتنا بہت سا روپیہ لے کر کیا کرتی؟ ہمارا مستقبل محفوظ سے محفوظ تر ہو رہا تھا لیکن میں کہاں تھی؟ میری گزرتی ہوئی زندگی کے لمحاتِ رائیگاں کا حساب کہاں تھا؟

یوسف اور اظفر بچپن کے دوست تھے، یار غار۔ مزاجوں کے تفاوت کے باوجود جب بھی انہیں موقع ملتا وہ مل بیٹھتے۔ اظفر نے باپ کی طرح تجارت اختیار کی اور لاکھوں کمائے۔ یوسف شروع ہی سے خواب دیکھتا تھا، محلوں کے، قلعوں کے، حویلیوں اور بھول بھلیوں کے، وہ آرکیٹیکٹ بن بیٹھا۔ سیمنٹ، بجری، پتھر، چونے، لوہے اور المونیم کے ڈھیر کو خواب نما عمارتوں میں بدل دینے والا انسان۔

یوسف کی بنائی ہوئی خواب خواب عمارتیں امریکہ، کانٹی نینٹ اور مشرقِ بعید کے ملکوں میں پھیلی ہوئی تھیں، وہ انٹرنیشنل سیلے بریٹی تھا۔

لندن میں جب میرا وقت یوسف کے ساتھ گزرا تو اس کی ذات کی ایک نئی جہت مجھ پر کھلی۔ ریت، پتھر اور چونے جیسی کھردری چیزوں سے مختلف عمارتوں کی تجسیم کرنے والا اندر

سے پور پور شاعر تھا۔ وہ جب عالم سرشاری میں ہوتا تو فن تعمیر پر عجیب زاویوں سے گفتگو کرتا۔ ایک مرتبہ اس نے کہا تھا کہ کسی عمارت کی تعمیر دراصل مادّے کا قلب ماہیت ہے۔

وہ گوتھک طرزِ تعمیر کا اور گرجا گھروں کا عاشق تھا۔ ان کی قربان گاہیں، ان کی راہداریاں، ان کے حجرۂ اعترافات، یہ تمام مقامات اس کے خیال میں کنائے تھے۔ انسانی نفس کی گہرائیوں، پشیمانیوں اور عیسیٰ مسیح سے قربت کے کنائے۔

وہ کہتا کہ کوئی بھی عظیم عمارت اپنے عہد کا استعارہ ہوتی ہے اور جب تک اس استعارے کو اپنے اندر رسمونہ لیا جائے، عمارت کا حسن اور اس کی سریت دیکھنے والے پر کھل نہیں سکتی۔

ایک رات وہ میرے فلیٹ پر پی رہا تھا اور باتیں کر رہا تھا۔ چار انگل شراب اس کے معدے میں پہنچ جاتی تو اس کے اندر کا شاعر جاگ جاتا اور اس کے منہ سے پھول جھڑنے لگتے۔ اس رات وہ باتیں کر رہا تھا، بورومینی کی، برمینی کی، البرٹی اور مائیکل اینجلو کی۔ وہ ان قدیم معماروں کو اپنا روحانی استاد سمجھتا تھا اور ان کی بنائی ہوئی عمارتوں کے ایک ایک طاقچے اور ستون پر اس کی جان جاتی تھی۔

اسی گفتگو کے دوران جانے کس طرح قدیم عمارتوں اور کھنڈروں کو چاندنی رات میں دیکھنے کی بات نکل آئی تو وہ بکھر گیا "کیسی بات کرتی ہو۔ یہ محض رومانیت زدہ عورتوں اور نالائق مردوں کے کرنے کی باتیں ہیں کہ روم کے فلاں کھنڈر کو چاندنی رات میں دیکھنا چاہیے اور پیرس کا فلاں کلیسا چاندنی میں کس قدر خوبصورت لگتا ہے۔ میں تمھیں بتاؤں، شالیمار باغ اور تاج محل کے سوا معدودے چند عمارتیں ہی ایسی ہیں جو چاندنی میں دیکھنے کے لیے بنائی گئی ہیں۔ دنیا کی تمام عظیم عمارتیں دن کے اُجالے میں دیکھنے کے لیے تعمیر ہوئی ہیں۔ چڑھتے ہوئے اور سہ پہر کے سورج کی ترچھی کرنیں ان عمارتوں کے شکوہ کو نمایاں کرتی ہیں۔ ایک ایک دیوار کے حسن کو اُجاگر کرتی ہیں اور ایک ایک گنبد کی گولائی کا احاطہ کرتی ہیں۔ قلعے، محل، حویلیاں دن میں دیکھنے کی اور برتنے کی چیزیں ہیں۔ رات بیشتر عمارتوں کا حسن چرا لیتی ہے۔ ان کے

خدو خال کا تیکھا پن چھپا لیتی ہے۔ اگر کوئی عمارت محض چاندنی رات ہی میں دِلکش نظر آتی ہے تو سمجھ لو کہ اسے بڑی عمارتوں کی صف میں شامل نہیں کیا جا سکتا۔

وہ تعمیرات کی اقتصادیات اور سماجیات پر بحث کرتا۔ فلاں عمارت پر کتنا صرف ہوا؟ یہ رقم کہاں سے آئی تھی؟ لگان کس علاقے کے لوگوں سے وصول کیا گیا تھا اور ان پر کتنی سختی روا رکھی گئی تھی؟ ان عمارات کو تعمیر کرنے والے آزاد مزدور تھے یا مجبور اور بے بس غلام؟ ان کے معمار اختراع پسند لوگ تھے یا لکیر کے فقیر؟ ان کے مزدور کام کرتے ہوئے گیت گایا کرتے تھے یا فضا محض ان کی پشت پر پڑنے والے چابکوں کی آواز سے گونجتی تھی؟

تعمیرات کے حوالے سے سیاست کے بارے میں اس کے خیالات بہت الجھے ہوئے اور ناپسندیدہ تھے۔ اور یہ ایک ایسا موضوع تھا جس پر میری اس کی خوب خوب بحث ہوتی۔ اس کا کہنا تھا کہ دنیا کی بیشتر عظیم تعمیرات مطلق العنان فرمانرواؤں کے فیصلوں اور خواہشوں کی مرہونِ منت ہیں اور یہ کہ جمہوریت فنِ تعمیر کو راس نہیں آسکتی۔

یوسف نے لندن کی ایک ایک تاریخی عمارت مجھے دکھائی۔ وہ جب کسی عمارت کے ستونوں، محرابوں، دروں، دروازوں اور طاقوں کے بارے میں بات کرتا، جب وہ روشنی اور سائے کا حساب بتاتا، جب موسموں کے اعتبار سے ہوا کے چلنے اور دھوپ کے اُترنے کا فرق بیان کرتا تو مجھے یوں محسوس ہوتا جیسے یہ سونی عمارتیں آباد ہو گئی ہیں، پھر سے سانس لے رہی ہیں، جیسے ابھی دھوپ فصیلوں سے ہوتی ہوئی قلعے کے قلب میں اتری ہے اور ہنری ہشتم نے اپنی مسہری پر کروٹ بدل کر صبح کا پہلا جرعہ حلق سے نیچے اتارا ہے۔

یوسف کو دوست داری کا عجیب ہنر آتا تھا۔ وہ اظفر کا دوست تھا لیکن میں جب اس سے ملتی، باتیں کرتی تو یوں محسوس ہوتا جیسے وہ محض میرا دوست ہے، کھرا، سچا، میرے تمام دُکھ سمجھنے والا۔ اس سے ملے ہوئے کچھ دن گذر جاتے تو دل میں خلش ہوتی، اس کا خط نہ آتا تو میں پریشان ہو کر خط لکھتی۔ کیسے ہو؟ کہاں ہو؟ کس حال میں ہو؟ اتنے دِنوں سے خط کیوں نہیں لکھا؟ اور پھر اس کا جواب آتا، طول طویل، دنیا جہان کی باتوں سے بھرا ہوا، میں اور اظفر

دونوں اس کا خط پڑھ کر خوش ہو جاتے۔

اظفر اور میں ہندوستان کے لیے روانہ ہونے والے تھے کہ اچانک ایک شام یوسف لندن سے آ پہنچا۔ وہ کچھ دِنوں ہمارے ساتھ رہنے آیا تھا۔ آرام کرنے، اپنی تھکن اُتارنے۔ یوسف کو معلوم ہوا کہ ہم ہندوستان جا رہے ہیں تو وہ بھی ہمارے ساتھ چل پڑا۔ ہم تینوں دلّی پہنچے اور اظفر حسبِ معمول مجھے ہوٹل میں چھوڑ کر بمبئی چلا گیا۔ وہ مایا موہ میں پھنسا تھا اور اس جال سے نکلنا اس کے بس کی بات نہ تھی۔

یوسف اور میں، ہم دونوں دلّی کے گلی کوچوں میں گھومتے رہے۔ قلعے، مسجدیں، مزار، دروازے، باؤلیاں، کونسی جگہ تھی جو ہم نے چھوڑی۔ کونسا ویرانہ تھا جو ہم نے آباد نہ کیا۔ ہم جمنا گئے، ہم گھاٹ کی سیڑھیاں اُترے اور ایک دوسرے کے پہلو بہ پہلو بیٹھ گئے۔ دوپہر کا گرم سورج ہمارے سروں پر تھا۔ ہر طرف ویرانی تھی، سناٹا تھا اور شاید یہ ویسا ہی کوئی لمحہ تھا جب خدا کی روح پانیوں پر جنبش کرتی تھی۔

میں نے جھک کر پانی میں ہاتھ ڈالا، پانی جو حیات کی اصل تھا اور یوسف سے مڑ کر کچھ کہا۔ وہ میری ہی طرف دیکھ رہا تھا اور ان آنکھوں میں کیا نہیں تھا۔

ہم اپنے تمام باطنی عذابوں اور ثوابوں، نادانیوں اور پشیمانیوں کے ساتھ ایک دوسرے کے سامنے عریاں تھے۔ آدم و حوا کی طرح جب انہوں نے شجرِ ممنوع کا پھل کھایا تھا اور برہنہ تن ہو گئے تھے، ہم دو نہ تھے، ہم جدا نہ تھے، ہم بہت دنوں سے ایک دوسرے کو دوستی کے نام پر اور خلوص کے نام پر دھوکا دیتے رہے تھے۔ وہ ایک لمحہ ہر بات بدل گیا، ہر شے منقلب ہو گئی۔ نہ تو تو رہا نہ تو میں رہا۔ وہ عجب گھڑی تھی کہ جس گھڑی لیا درس نسخۂ عشق کا۔

اچانک کشتی ڈگمگائی، آنکھ کی پتلی پر جو راس لیلا رچی تھی وہ معدوم ہو گئی، جمنا کا پانی چشم زدن میں غائب ہو گیا۔ ہم کنجھر جھیل کے آبِ رواں پر تھے۔ یوسف اپنا زرد سوئمنگ کاسٹیوم پہنے کشتی کے اگلے حصے میں کھڑا تھا۔ بدن کو تولتا ہوا، پھر چھپاکا ہوا اور اس کا سنہرا بدن سبز پانیوں میں اتر گیا۔ وہ ہماری کشتی کے ساتھ ساتھ تیر رہا تھا۔ ہم پر پانی کے چھینٹے اُڑاتا ہوا، پانی

میں ڈبکی لگا کر پھر اُبھر تا ہوا۔ اس کے ننگے بدن کو دیکھ کر مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں نے اسی کی پسلی سے جنم لیا ہو، جیسے ہم ایک تن ہوں، زمین کا پہلا جوڑا۔ میں نے نظریں نیچی کرلیں، میں اُن لمحوں سے ڈرتی تھی جب اظفر میرے دل کی تحریر میرے چہرے پر پڑھ لے۔

دُور زمین و آسمان ایک دوسرے سے لپٹے ہوئے تھے، محض فریبِ نظر۔ میری آنکھیں بھیگ گئیں۔ ہم دونوں بھی افق کا وہ کنارہ تھے جسے دور سے دیکھو تو محسوس ہوتا ہے کہ زمین و آسمان شیر و شکر ہو رہے ہیں اور جب نظر کا فریب درمیان سے ہٹ جاتا تو ہم زمین و آسمان تھے جو کبھی نہیں مل سکتے۔

میں زمین تھی، ٹھوس، پتھریلی، اپنی جگہ اٹل۔ اور وہ آسمان تھا، محض خلا، آنکھ کا دھوکا۔ میں عورت تھی، کمزور، بے بضاعت، میں اس کے لیے کسی بھی انتہا تک جا سکتی تھی لیکن یوسف مرد تھا، بہادر، جی دار اس لیے کچھ نہیں کرسکتا تھا۔ لوگ کیا کہیں گے، بچوں کا کیا ہوگا، اظفر پر کیا گزرے گی، وہ دنیا کے تمام برِّ اعظم گھوم آیا۔ دنیا بھر کی دولت اس نے اکٹھی کرلی۔ انٹرنیشنل سیلے بریٹی بن بیٹھا لیکن متوسط طبقے کی اخلاقی اقدار اس کے اندر اپنے پنجے گاڑے بیٹھی تھیں۔ وہ دوست کی لاعلمی میں اس کی بیوی کو شیئر تو کرسکتا ہے لیکن اس بات کا تصور بھی نہیں کرسکتا کہ اظفر کا سامنا کرے اور اسے ایمانداری کے ساتھ اپنے اور میرے نفس کی حالت سے آگاہ کرے اور پھر فیصلہ اس پر چھوڑ دے، مجھے معلوم تھا کہ اظفر کا فیصلہ کیا ہوگا اور یوسف بھی جانتا تھا لیکن یوسف کی اخلاقی اقدار بھی خوب تھیں، محض منافقت، محض ریاکاری۔

اور اب میں دو مردوں کے درمیان زندگی گزارتی ہوں۔ اظفر، جس کی زمین اپنی نہیں، جس کے گھر میں سیندھ لگ چکی ہے اور یوسف جو اپنی زمین کو دوسرے کے تسلط سے آزاد کراتے ہوئے ڈرتا ہے جس کی زمین کا خراج کسی دوسرے کے خزانے میں جمع ہوتا ہے اور ان دونوں کے درمیان میں ہوں: تلملے ہے مرغِ قبلہ نما آشیانے میں۔

''بیگم اظفر، کیا آپ جانتی ہیں کہ اس وقت آپ کہاں ہیں؟'' احسن نے اچانک ڈرامائی انداز میں سوال کیا۔

"میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی؟" میں نے قدرے حیران ہو کر احسن کو دیکھا، وہ اظفر کے لندن آفس کا منیجر تھا اور ان دنوں اپنی بیوی کے ساتھ کراچی آیا ہوا تھا۔ "آپ اس وقت نوری جام تماچی کے مزار پر سے گزر رہی ہیں۔" اس نے مجھے مطلع کیا۔

"کیا پہیلیاں بجھا رہے ہو احسن؟" اظفر بھی اب اس طرف متوجہ ہو گیا تھا۔

"اظفر صاحب، ہم واقعی نوری جام تماچی کے مزار پر سے گزر رہے ہیں۔ یہ دراصل مان سون کا موسم ہے۔ پانی چھلکا پڑ رہا ہے اس لیے دونوں کے مزار زیرِ آب ہیں ورنہ عام دنوں میں ایک چھوٹے سے ٹاپو پر ان دونوں کے شکستہ مزار نظر آتے ہیں، آس پاس کے لوگ تو یہ بھی کہتے ہیں کہ چاندنی راتوں میں نوری انہیں جھیل کی سیر کرتی نظر آتی ہے۔" احسن نے کہا۔

"بھئی تم لوگ آخر کس چکر میں پڑ گئے ہو، ابھی تھوڑی دیر پہلے ہماری بیگم صاحبہ مکلی کے مزارات سے لو لگا رہی تھیں، بڑی مشکل سے انہیں وہاں سے گھسیٹ کر لائے ہیں۔ اب تم پھر مزاروں کا ذکر لے بیٹھے ہو۔" اظفر نے برا سا منہ بنا کر کہا۔ "اُدھر یوسف ہے تو وہ اتنی سنجیدگی سے پانی میں ڈبکیاں لگا رہا ہے جیسے کچھ ڈھونڈ رہا ہو۔" پھر اس نے بہ آواز بلند یوسف کو مخاطب کیا۔ "یار پلٹ آؤ، کسی شہزادی نے اپنی Chastity Belt کی چابی یہاں نہیں پھینکی ہے جو تم ڈبکیاں لگا رہے ہو۔"

یوسف نے اس کا جملہ سنا تو مسکرایا اور کشتی کی طرف پلٹا۔ احسن بھی ہنسنے لگا۔ "یوسف صاحب نے تو بہت سی چابیاں اکٹھی کی ہوں گی۔"

"یہ میرا یار جو ہے بہت گھنا ہے، ایسی باتوں کی ہوا بھی نہیں لگنے دیتا۔" اظفر نے کہا۔

اب یوسف کشتی میں پہنچ چکا تھا اور اس کے بدن سے ٹپکتے ہوئے پانی کے قطرے کشتی کے فرش پر جمع ہو رہے تھے۔ وہاں پڑی مچھلی اب ختم ہو چکی تھی۔ صوفیہ احسن نے نگاہیں اٹھا کر بے اعتنائی سے ہم سب کو دیکھا اور پھر اپنی اسکیچ بک پر جھک گئی۔ اس میں سب سے بڑی خرابی کم گوئی اور سب سے بڑی خوبی مصوری تھی۔ چند ہفتوں بعد سڈنی میں اس کی تصویروں کی نمائش ہونے والی تھی۔

میں نے جھک کر پانی کو دیکھا، پانی جو بہتی ہوئی سریت ہے، پھیلی ہوئی ہیبت ہے، حیات کی اصل ہے، رگ وید میں کہا گیا ہے:

"اس وقت نہ عدم تھا نہ وجود، نہ عالم باد اور نہ آسمان، جو اس سے پرے ہے۔ کیا چیز سب کو محیط تھی اور وہ سب کچھ کہاں قائم تھا؟ کیا وہ پانی اور عمق بے پایاں تھا؟"

یہ پانی جس کے سینے پر ہم اس وقت رواں تھے، عمقِ بے پایاں نہ تھا لیکن پانی تھا۔ پانی جس میں سب سے پہلے "کام" (خواہش) نمودار ہوئی اور یہ خواہش عقل یا روح کا ابتدائی تخم تھی۔

خواہش، عقل، روح، عشق --- میں ان چاروں کے دام میں تھی۔ بادل کا ایک ٹکڑا ہماری کشتی کے اوپر سایہ کیے ہوئے تھا اور ساتھ ساتھ چل رہا تھا، شاید ہم واقعی نوری جام تماچی کے مزار پر سے گزر رہے ہوں گے۔ صدیوں پہلے کا وہ زمانہ کیسا رہا ہو گا جب کنجھر کے کنارے مچھیروں کی ایک بستی تھی اور سمہ خاندان کا سردار جام تماچی اس بستی کی ایک مچھیرن نوری کو اپنا دل ہار گیا تھا۔

یہ جو ساتھ جاگتے تھے، اب صدیوں سے ساتھ سو رہے تھے اور ان کے ساتھ نہ جانے کتنے مکمل اور نامکمل بوسے سو رہے تھے، کتنی آسودہ اور ناآسودہ ہم آغوشیاں سو رہی تھیں۔ مجھے شاہ کا "سرکا موڈ" یاد آیا۔ یہ راگنی جس کا تعلق دیپک راگ سے بتایا جاتا ہے، شروع سے آخر تک نوری جام تماچی کے عشق بلاخیز کا قصہ سناتی ہے۔ شاہ کی آواز آئی:

"دھن دولت جنتا میں بانٹے، مایا جال کو توڑا کنجھر کی گندری کے کارن راج پاٹ کو چھوڑا"

راج پاٹ کو چھوڑنے والا اور کنجھر کی گندری تہہ آب سوتے تھے۔ لیکن غرقِ دریا ہونے کی تمنا تو غالب نے کی تھی۔ 'ہوئے کیوں نہ غرقِ دریا، نہ کہیں مزار ہوتا۔'

مکلی کے مزار میری نگاہوں کے سامنے گھوم گئے۔ چودھویں صدی کی قبروں پر سایہ کیے چھتریاں، فیروزی اور گہرے نیلے رنگ کی شیشے کی طرح چمکتی اینٹیں، کائی نے دیواروں کو سیاہ کر دیا تھا۔ یہ میرزا خان بابا بن میرزا خان عیسیٰ خان ترخان (اوّل) کا مزار ہے۔ یہاں ملِک

راجپال اور اہنسا بائی سوتے ہیں۔ میرزا باقی بیگ اُزبک، میرزا طغرل بیگ۔ یہ سونے والے جانے کہاں کہاں سے آئے تھے؟ کس کس علاقے کی مٹی کا خمیر یہاں قطار اندر قطار سوتا تھا۔ ترک، راجپوت، مغل، اُزبک، ارغون --- دوست، دشمن، باپ، بیٹے، محرم، نامحرم سب خاک میں مل کر خاک ہوگئے تھے۔ مٹی نے تمام راز اپنے اندر چھپا لیے تھے۔ جیسے ماں اپنے سینے میں بچوں کے عیب چھپا لیتی ہے۔

اور جب چلتے چلتے رُک کر میں نے ایک قبر کا کتبہ پڑھا تو ٹھٹھک گئی تھی، لوحِ مزار پر لکھا تھا:

"بہ تاریخ بیست ششم ذی الحجہ ۱۰۸۲ھ عصمت پناہ جہاں بیگم فوت شد۔"

اس لمحے مجھے خیال آیا کہ میری لوحِ مزار پر "عصمت پناہ" کا لفظ کس قدر سجے گا؟ اور اسی لیے میں نے ہنس کر اظفر سے کہا تھا "میری لوحِ مزار پر بھی 'عصمت پناہ' کندہ کرا دینا۔"

ہم کنجھر کے وسط میں تھے جب اظفر نے کشتی والے سے واپسی کے لیے کہا۔ جس پانی میں ہم نے آگے کا سفر کیا تھا اسی پانی میں اب واپس جا رہے تھے۔

اکثر میرا جی چاہتا کہ میں وقت میں پیچھے چلی جاؤں لیکن واپسی کا سفر ممکن نہیں۔ میرا جی چاہتا ہے یوسف سے پوچھوں کہ تم یہ کب تک چھپاؤ گے کہ Chastity Belt کی چابی تمہارے پاس ہے؟ میں کسی ایک مرد کی عورت ہو کر رہنا چاہتی ہوں۔

کشتی کنارے کی طرف جا رہی ہے لیکن میں کنارے کی طرف نہیں جا سکتی۔ مجھے پانی کے بیچوں بیچ کھڑے رہنا ہے اور اُس دن کا انتظار کرنا ہے جب چابی یوسف سے بھی گم ہو جائے۔ اظفر تو اُسے گم کر ہی چکا ہے۔ ☐☐

سریندر پرکاش

سریندر پرکاش (قلمی نام) کا اصل نام سریندر کمار اوبیرائے ہے۔ ۲۶/مئی ۱۹۳۰ء کو لائل پور (پاکستان) میں پیدا ہوئے۔ نئی اردو کہانی کا ایک اہم اور معروف نام۔ ان کے تین افسانوی مجموعے شائع ہو چکے ہیں: ''دوسرے آدمی کا ڈرائنگ روم''، ''برف پر مکالمہ'' اور ''بازگوئی''۔ ''بازگوئی'' پر انہیں ساہتیہ اکادمی ایوارڈ ملا۔ ان کی بیشتر کہانیوں کا ترجمہ کئی ملکی اور غیر ملکی زبانوں میں چھپ چکا ہے۔ سریندر پرکاش فلمی اسکرپٹ بھی لکھتے ہیں اور آجکل بمبئی میں قیام پذیر ہیں۔ ''دیوتا'' سریندر پرکاش کا پہلا افسانہ ہے جو ہفت روزہ ''پارس'' لاہور میں شائع ہوا۔

بجوکا

سریندر پرکاش

پریم چند کی کہانی کا ہوری اتنا بوڑھا ہو چکا تھا کہ اس کی پلکوں اور بھوؤں تک کے بال سفید ہو گئے تھے۔ کمر میں خم پڑ گیا تھا اور ہاتھوں کی نسیں سانولے کھردرے گوشت سے ابھر آئی تھیں۔

اس اثنا میں اس کے ہاں دو بیٹے ہوئے تھے، جو اب نہیں رہے۔ ایک گنگا میں نہا رہا تھا کہ ڈوب گیا اور دوسرا پولیس مقابلے میں مارا گیا۔ پولیس کے ساتھ اس کا مقابلہ کیوں ہوا اس میں کچھ ایسی بتانے کی بات نہیں۔ جب بھی کوئی آدمی اپنے وجود سے واقف ہوتا ہے اور اپنے اردگرد پھیلی ہوئی بے چینی محسوس کرنے لگتا ہے تو اس کا پولیس کے ساتھ

مقابلہ ہو جانا قدرتی ہو جاتا ہے۔ بس ایسا ہی کچھ اس کے ساتھ بھی ہوا تھا...... اور بوڑھے ہوری کے ہاتھ ہل کے ہتھے کو تھامے ہوئے ایک بار ڈھیلے پڑے ذرا کانپے اور پھر ان کی گرفت اپنے آپ مضبوط ہو گئی۔ اس نے بیلوں کو ہانک لگائی اور ہل کا پھل زمین کا سینہ چیرتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

اس دن آسمان سورج نکلنے سے پہلے کچھ زیادہ ہی سرخ تھا اور ہوری کے آنگن کے کنوئیں کے گرد پانچوں بچے ننگ دھڑنگ بیٹھے نہار رہے تھے۔ اس کی بڑی بہو کنوئیں سے پانی نکال نکال کر اُن پر باری باری انڈیلتی جا رہی تھی اور وہ اُچھلتے ہوئے اپنا پنڈا ملتے پانی اچھال رہے تھے۔ چھوٹی بہو بڑی بڑی روٹیاں بنا کر چنگیری میں ڈال رہی تھی اور ہوری اندر کپڑے بدل کر پگڑی باندھ رہا تھا۔ پگڑی باندھ کر اس نے طاقچے میں رکھے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا...... سارے چہرے پر لکیریں پھیل گئی تھیں۔ اس نے قریب ہی لٹکی ہوئی ہنومان جی کی چھوٹی سی تصویر کے سامنے آنکھیں بند کر کے دونوں ہاتھ جوڑ کر سر جھکایا اور پھر دروازے میں سے گذر کر باہر آنگن میں آ گیا۔

''سب تیار ہیں''؟ اس نے قدرے اونچی آواز میں پوچھا۔

''ہاں باپو......'' سب بچے ایک ساتھ بول اٹھے۔ بہوؤں نے اپنے سروں پر پلّو درست کیے اور ان کے ہاتھ تیزی سے چلنے لگے۔ ہوری نے دیکھا ابھی کوئی بھی تیار نہیں تھا۔ سب جھوٹ بول رہے تھے۔ اس نے سوچا یہ جھوٹ ہماری زندگی کے لیے کتنا ضروری ہے۔ اگر بھگوان نے ہمیں جھوٹ جیسی نعمت نہ دی ہوتی تو لوگ دھڑا دھڑ مرنے لگ جاتے۔ اس کے پاس جینے کا کوئی بہانہ نہ رہ جاتا۔ ہم پہلے جھوٹ بولتے ہیں اور پھر اسے سچ ثابت کرنے کی کوشش میں دیر تک زندہ رہتے ہیں۔

ہوری کے پوتے پوتیاں اور بہوئیں...... ابھی ابھی بولے ہوئے جھوٹ کو سچ ثابت کرنے میں پوری تندہی سے جٹ گئیں۔ جب تک ہوری نے ایک کونے

میں پڑے کٹائی کے اوزار نکالے......اور اب وہ سچ مچ تیار ہو چکے تھے۔
ان کا کھیت لہلہا اٹھا تھا فصل پک گئی تھی اور آج کٹائی کا دن تھا۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے کوئی تہوار ہو۔ سب بڑے چاؤ سے جلد از جلد کھیت پر پہنچنے کی کوشش میں تھے کہ انہوں نے دیکھا سورج کی سنہری کرنوں نے سارے گھر کو اپنے جادو میں جکڑ لیا ہے۔
ہوری نے انگوچھا کندھے پر رکھتے ہوئے سوچا۔ کتنا اچھا سمے آ پہنچا ہے نہ اہلمد کی دھونس نہ بنیے کا کھٹکا نہ انگریز کی زور زبردستی اور نہ زمیندار کا حصہ --- اس کی نظروں کے سامنے ہرے ہرے خوشے جھوم اٹھے۔
''چلو بابو'' اس کے بڑے پوتے نے اس کی انگلی پکڑ لی، باقی بچے اس کی ٹانگوں کے ساتھ لپٹ گئے۔ بڑی بہو نے کوٹھری کا دروازہ بند کیا اور چھوٹی بہو نے روٹیوں کی پوٹلی سر پر رکھی۔
بیر بجرنگی کا نام لے کر سب باہر کی چاردیواری والے دروازے میں سے نکل کر گلی میں آگئے اور پھر دائیں طرف مڑ کر اپنے کھیت کی طرف بڑھنے لگے۔
گاؤں کی گلیوں، گلیاروں میں چہل پہل شروع ہو چکی تھی۔ ادگ کھیتوں کو آ جا رہے تھے۔ سب کے دلوں میں مسرت کے تار چھوٹتے محسوس ہو رہے تھے۔ سب کی آنکھیں پکی فصلیں دیکھ کر چمک رہی تھیں۔ ہوری کو لگا جیسے زندگی کل سے آج ذرا مختلف ہے۔ اس نے پلٹ کر اپنے پیچھے آتے ہوئے بچوں کی طرف دیکھا۔ وہ بالک ویسے ہی لگ رہے تھے جیسے کسان کے بچے ہوتے ہیں۔ سانولے مریل سے --- جو جیپ گاڑی کے پہیوں کی آواز اور موسم کی آہٹ سے ڈر جاتے ہیں۔ بہوئیں، ویسی ہی تھیں جیسی غریب کسان کی بیوہ عورتیں ہوتی ہیں۔ چہرے گھونگھٹوں میں چھپے ہوئے اور لباس کی ایک ایک سلوٹ میں غریبی جوؤں کی طرح چھپی بیٹھی۔
وہ سر جھکا کر پھر آگے بڑھنے لگا۔ گاؤں کے آخری مکان سے گزر کر آگے کھلے

کھیت تھے۔ قریب ہی رہٹ خاموش کھڑا تھا۔ نیم کے درخت کے نیچے ایک کتا بے فکری سے سویا ہوا تھا۔ دور طویلے میں کچھ گائیں، بھینسیں اور بیل چارہ کھا کر پھنکار رہے تھے۔ سامنے دور دور تک لہلہاتے ہوئے سنہری کھیت تھے---ان سب کھیتوں کے بعد ذرا دور جب یہ سب کھیت ختم ہو جائیں گے اور پھر چھوٹا سا نالہ پار کر کے الگ تھلگ ہوری کا کھیت تھا جس میں جھوناپک کر انگڑائیاں لے رہا تھا۔

وہ سب پگڈنڈیوں پر چلتے ہوئے دور سے ایسے لگ رہے تھے جیسے رنگ برنگے کیڑے سوکھی گھاس پر رینگ رہے ہوں......وہ سب اپنے کھیت کی طرف جا رہے تھے۔ جس کے آگے تھل تھا۔ دُور دُور تک پھیلا ہوا جس میں کہیں ہریالی نظر نہ آتی تھی بس تھوری بے جان مٹی تھی۔ جس میں پاؤں رکھتے ہی دھنس جاتا تھا۔ اور مٹی یوں بھربھری ہو گئی تھی جیسے اس کے دونوں بیٹوں کی ہڈیاں چتا میں جل کر پھول بن گئی تھیں اور پھر ہاتھ لگاتے ہی ریت کی طرح بکھر جاتی تھیں۔ وہ تھل دھیرے دھیرے بڑھ رہا تھا۔ ہوری کو یاد آیا پچھلے پچاس برسوں میں وہ دو ہاتھ آگے بڑھ آیا تھا۔ ہوری چاہتا تھا جب تک بچے جوان ہوں وہ تھل اس کے کھیت تک نہ پہنچے اور تب تک وہ خود کسی تھل کا حصہ بن چکا ہو گا۔

پگڈنڈیوں کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ اور اس پر ہوری اور اس کے خاندان کے لوگوں کے حرکت کرتے ہوئے ننگے پاؤں......

سورج آسمان کی مشرقی کھڑکی میں سے جھانک کر دیکھ رہا تھا۔

چلتے چلتے ان کے پاؤں مٹی سے اٹ گئے تھے۔ کئی ارد گرد کے کھیتوں میں لوگ کٹائی کرنے میں مصروف تھے۔ وہ آتے جاتے کو رام رام کہتے اور پھر کسی انجانے جوش اور ولولے کے ساتھ ٹہنیوں کو درانتی سے کاٹ کر ایک طرف رکھ دیتے۔

انہوں نے باری باری نالہ پار کیا۔ نالے میں پانی نام کو بھی نہ تھا---اندر کی ریت

ملی مٹی بالکل خشک ہو چکی تھی اور اس پر عجیب و غریب نقش و نگار بنے تھے۔ وہ پانی کے پاؤں کے نشان تھے ---اور سامنے لہلہاتا ہوا کھیت نظر آ رہا تھا۔ سب کا دل بلیوں اچھلنے لگا...... فصل کٹے گی تو ان کا آنگن پھوس سے بھر جائے گا اور کوٹھری اناج سے، پھر کھٹیا پر بیٹھ کر بھات کھانے کا مزہ آئے گا۔ کیا ڈکاریں آئیں گی پیٹ بھر جانے کے بعد۔ ان سب نے ایک ہی بار سوچا۔

اچانک ہوری کے قدم رک گئے۔ وہ سب بھی رک گئے۔ ہوری کھیت کی طرف حیرانی سے دیکھ رہا تھا۔ وہ سب کبھی ہوری کو اور کبھی کھیت کو دیکھ رہے تھے کہ اچانک ہوری کے جسم میں جیسے بجلی کی سی پھرتی پیدا ہوئی۔ اس نے چند قدم آگے بڑھ کر بڑے جوش سے آواز لگائی۔

"ابے کون ہے......رے......رے......"؟

اور پھر سب نے دیکھا ان کے کھیت میں پکی ہوئی فصل میں کچھ بے چینی کے آثار تھے۔ اب وہ سب ہوری کے پیچھے تیز تیز قدم بڑھانے لگے۔ ہوری پھر چلایا۔

"ابے کون ہے رے---بولتا کیوں نہیں---کون فصل کاٹ رہا ہے میری"؟

مگر کھیت میں سے کوئی جواب نہ ملا۔ اب وہ قریب آ چکے تھے اور کھیت کے دوسرے کونے پر درانتی چلنے کی سراپ سراپ کی آواز بالکل صاف سنائی دے رہی تھی۔ سب قدرے سہم گئے۔ پھر ہوری نے ہمت سے للکارا۔

"کون ہے حرام کا جنا...... بولتا کیوں نہیں"؟ اور اپنے ہاتھ میں پکڑی درانتی سونت لی۔

اچانک کھیت کے پرلے حصہ میں سے ایک ڈھانچہ سا ابھرا اور جیسے مسکرا کر انہیں دیکھنے لگا ہو...... پھر اس کی آواز سنائی دی۔

"میں ہوں ہوری کاکا---بجو کا!" اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑی درانتی فضا میں

ہلاتے ہوئے جواب دیا۔

سب کی مارے خوف کے گھٹی گھٹی سی چیخ نکل گئی۔ ان کے رنگ زرد پڑ گئے اور ہوری کے ہونٹوں پر گویا سفید پپڑی سی جم گئی--- کچھ دیر کے لیے سب سکتے میں آگئے اور بالکل خاموش کھڑے رہے--- وہ کچھ دیر کتنی تھی؟ ایک پل ایک صدی یا پھر ایک یگ--- اس کا ان میں سے کسی کو اندازہ نہ ہوا۔ جب تک کہ انہوں نے ہوری کی غصہ سے کانپتی ہوئی آواز نہ سنی انہیں اپنی زندگی کا احساس نہ ہوا۔

"تم...... بجوکا...... تم۔ ارے تم کو تو میں نے کھیت کی نگرانی کے لیے بنایا تھا--- بانس کی پھانکوں سے اور تم کو اس انگریز شکاری کے کپڑے پہنائے تھے جس کے شکار میں میرا باپ ہانکا لگاتا تھا اور وہ جاتے ہوئے خوش ہو کر اپنے پھٹے ہوئے خاکی کپڑے میرے باپ کو دے گیا تھا۔ تیرا چہرہ میرے گھر کی بیکار ہانڈی سے بنا تھا اور اس پر اسی انگریز شکاری کا ٹوپا رکھ دیا تھا۔ ارے تو بے جان پتلا میری فصل کاٹ رہا ہے۔"؟

ہوری کہتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا اور بجوکا بدستور ان کی طرف دیکھتا ہوا مسکرا رہا تھا۔ جیسے اس پر ہوری کی کسی بات کا کوئی اثر نہ ہوا ہو۔ جیسے ہی وہ قریب پہنچے انہوں نے دیکھا--- فصل ایک چوتھائی کے قریب کٹ چکی ہے اور بجوکا اس کے قریب درانتی ہاتھ میں لیے کھڑا مسکرا رہا ہے۔ وہ سب حیران ہوئے کہ اس کے پاس درانتی کہاں سے آگئی--- وہ کئی مہینوں سے اسے دیکھ رہے تھے۔ بے جان بجوکا دونوں ہاتھوں سے خالی کھڑا رہتا تھا--- مگر آج--- وہ آدمی لگ رہا تھا۔ گوشت پوست کا ان جیسا آدمی--- یہ منظر دیکھ کر ہوری تو جیسے پاگل ہو اٹھا۔ اس نے آگے بڑھ کر اسے ایک زوردار دھکا دیا--- مگر بجوکا تو اپنی جگہ سے بالکل نہ ہلا۔ البتہ ہوری اپنے ہی زور کی مار کھا کر دور جا گرا--- سب لوگ چیختے ہوئے ہوری کی طرف بڑھے۔ وہ اپنی کمر پر ہاتھ رکھے اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا--- سب نے اُسے سہارا دیا اور اُس نے خوفزدہ ہو کر بجوکا کی طرف

دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تو...... تو مجھ سے بھی طاقتور ہو چکا ہے بجوکا! مجھ سے...... ؟ جس نے تمہیں اپنے ہاتھوں سے بنایا۔ اپنی فصل کی حفاظت کے واسطے۔''

بجوکا حسب معمول مسکرا رہا تھا، پھر بولا۔ ''تم خواہ مخواہ خفا ہو رہے ہو ہوری کاکا، میں نے تو صرف اپنے حصے کی فصل کاٹی ہے۔ ایک چوتھائی---''

''لیکن تم کو کیا حق ہے میرے بچوں کا حصہ لینے کا۔ تم کون ہوتے ہو۔''

''میرا حق ہے ہوری کاکا...... کیونکہ میں ہوں...... اور میں نے اس کھیت کی حفاظت کی ہے۔''

''لیکن میں نے تو تمہیں بے جان سمجھ کر یہاں کھڑا کیا تھا اور بے جان چیز کا کوئی حق نہیں۔ یہ تمہارے ہاتھ میں درانتی کہاں سے آگئی۔''؟

بجوکا نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔ ''تم بڑے بھولے ہو ہوری کاکا۔ خود ہی مجھ سے باتیں کر رہے ہو...... اور پھر مجھ کو بے جان سمجھتے ہو......''؟

''لیکن تم کو یہ درانتی اور زندگی کس نے دی...... ؟ میں نے تو نہیں دی تھی!''

''یہ مجھے آپ سے آپ مل گئی...... جس دن تم نے مجھے بنانے کے لیے بانس کی پھانکیں چیری تھیں۔ انگریز شکاری کے پھٹے پرانے کپڑے لائے تھے، گھر کی بے کار ہانڈی پر میری آنکھیں ناک، کان اور منہ بنایا تھا۔ اسی دن ان سب چیزوں میں زندگی کلبلا رہی تھی اور یہ سب مل کر میں بنا اور میں فصل پکنے تک یہاں کھڑا رہا اور ایک درانتی میرے سارے وجود میں سے آہستہ آہستہ نکلتی رہی---اور جب فصل پک گئی وہ درانتی میرے ہاتھ میں تھی۔ لیکن میں نے تمہاری امانت میں خیانت نہیں کی--- میں آج کے دن کا انتظار کرتا رہا اور آج تم اپنی فصل کاٹنے آئے ہو--- میں نے اپنا حصہ کاٹ لیا، اس میں بگڑنے کی کیا بات---'' بجوکا نے آہستہ آہستہ سب کہا...... تاکہ ان سب کو اس کی بات اچھی طرح سمجھ میں آجائے۔

"نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ یہ سب سازش ہے۔ میں تمہیں زندہ نہیں مانتا۔ یہ سب چھلاوہ ہے۔ میں پنچایت سے اس کا فیصلہ کراؤں گا۔ تم درانتی پھینک دو۔ میں تمہیں ایک تنکا بھی لے جانے نہیں دوں گا......" ہوری چیخا اور بجوکا نے مسکراتے ہوئے درانتی پھینک دی۔

گاؤں کی چوپال پر پنچایت لگی...... پنچ اور سرپنچ سب موجود تھے۔ ہوری ---اپنے پوتے پوتیوں کے ساتھ بیچ میں بیٹھا تھا۔ اس کا چہرہ مارے غم کے مرجھایا ہوا تھا۔ اس کی دونوں بہوئیں دوسری عورتوں کے ساتھ کھڑی تھیں اور بجوکا کا انتظار تھا۔ آج پنچایت نے اپنا فیصلہ سنانا تھا۔ مقدمہ کے دونوں فریق اپنا اپنا بیان دے چکے تھے۔

آخر دور سے بجوکا خراماں خراماں آتا ہوا دکھائی دیا--- سب کی نظریں اس طرف اٹھ گئیں وہ ویسے ہی مسکراتا ہوا آرہا تھا۔ جیسے ہی وہ چوپال میں داخل ہوا۔ سب غیر ارادی طور پر اٹھ کھڑے ہوئے اور ان کے سر تعظیماً جھک گئے۔ ہوری یہ تماشہ دیکھ کر تڑپ اٹھا، اسے لگا جیسے بجوکا نے سارے گاؤں کے لوگوں کا ضمیر خرید لیا ہے۔ پنچایت کا انصاف خرید لیا ہے۔ وہ تیز پانی میں بے بس آدمی کی طرح ہاتھ پاؤں مارتا ہوا محسوس کرنے لگا۔

"سنو--- یہ شاید ہماری زندگی کی آخری فصل ہے۔ ابھی تھل کھیت سے کچھ دوری پر ہے۔ میں تمہیں نصیحت کرتا ہوں، اپنی فصل کی حفاظت کے لیے پھر کبھی بجوکا نہ بنانا۔ اگلے برس جب ہل چلیں گے ---- بیج بویا جائے گا اور بارش کا امرت کھیت میں سے کونپلوں کو جنم دے گا تو مجھے ایک بانس پر باندھ کر کھیت میں کھڑا کر دینا...... بجوکا کی جگہ پر۔ میں تب تک تمہاری فصلوں کی حفاظت کروں گا، جب تک تھل آگے بڑھ کر کھیت کی مٹی کو نگل نہیں لے گا اور تمہارے کھیتوں کی مٹی بھربھری نہیں ہو جائے گی۔ مجھے وہاں سے ہٹانا نہیں--- کہ بجوکا بے جان نہیں ہوتا--- آپ سے آپ اسے

زندگی مل جاتی ہے اور اس کا وجود اسے درانتی تھمادیتا ہے اور اس کا فصل کی ایک چوتھائی پر حق ہو جاتا ہے۔" ہوری نے کہا اور پھر آہستہ آہستہ اپنے کھیت کی طرف بڑھا۔ اس کے پوتے اور پوتیاں اس کے پیچھے تھے اور پھر اس کی بہوئیں اور ان کے پیچھے گاؤں کے دوسرے لوگ سر جھکائے ہوئے چل رہے تھے۔

کھیت کے قریب پہنچ کر ہوری گرا اور ختم ہو گیا، اس کے پوتے پوتیوں نے اسے ایک بانس سے باندھنا شروع کیا اور باقی کے سب لوگ یہ تماشہ دیکھتے رہے۔ بجو کا نے اپنے سر پر رکھا شکاری ٹوپا اتار کر سینے کے ساتھ لگا لیا اور اپنا سر جھکا دیا۔ ☐☐

سلیم آغا قزلباش

سلیم آغا قزلباش ۱۹۵۶ء کو لاہور میں پیدا ہوئے۔ پنجاب یونیورسٹی سے اردو میں ایم۔اے۔ کرنے کے بعد ۱۹۹۶ء میں پنجاب یونیورسٹی سے ہی افسانے کے فن پر مقالہ لکھ کر پی ایچ۔ڈی کی ڈگری لی۔ انشائیوں اور نثری نظموں کی کتابوں کے علاوہ ان کے افسانوی مجموعوں میں ''انگور کی بیل'' اور ''صبح ہونے تک'' شامل ہیں۔ ''اکائی'' اوراق لاہور (۱۹۹۷ء) میں پہلی بار شائع ہوا۔ پاکستانی زندگی کی دیہی عکاسی کے ضمن میں ان کے افسانے بڑے مستند اور کارگر ہیں۔

اکائی

سلیم آغا قزلباش

اس نے اپنی جان پر کھیل کر اس لڑکی کو ڈوبنے سے بچانے کی کوشش کی مگر جب وہ اسے دونوں ہاتھوں پر اٹھائے کنارے پر پہنچا تو وہ دم توڑ چکی تھی، لیکن قتل کا الزام اس کے سر تھوپ دیا گیا۔ کسی نے بھی اسے لڑکی کو بچاتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ سب کا خیال تھا کہ اس نے کسی پرانی رنجش کی بنا پر اسے پانی میں ڈبو کر ہلاک کیا ہے۔ آخر کافی سوچ بچار کے بعد قبیلے کے سرپنچوں نے متفقہ طور پر اس کے لیے یہ سزا مقرر کی کہ وہ اپنے دونوں ہاتھوں، پیروں میں سے کسی ایک جوڑی کو کٹوانے یا اپنی دونوں آنکھیں نکلوانے کا انتخاب خود کرے۔ اس انتخاب کے لیے اسے صرف رات بھر کی مہلت دی گئی اور وہ بھی اس کڑی شرط کے ساتھ کہ اگر اس نے پوچھے

تک کوئی فیصلہ نہ کیا تو اس کا سر قلم کر دیا جائے گا۔

جب وہ اسے کوٹھری میں بند کر کے چلے گئے تو اس نے دو تین گہرے سانس لے کر خود کو ذہنی طور پر مجتمع کرنے کی کوشش کی۔ اسے ایک حتمی فیصلے پر پہنچنا تھا اور اس فیصلے پر ہی اس کی آئندہ زندگی کا سارا دارومدار تھا۔ اس کا ایک غلط قدم اس کو تباہی و بربادی کے دہانے پر لا سکتا تھا۔ یکبارگی اس کے تن بدن میں تناؤ کی سی کیفیت پیدا ہو گئی۔ دل سینے کی بند کوٹھری کی دیواروں سے یوں دیوانہ وار ٹکرانے لگا جیسے اسے توڑ کر فرار ہو جانا چاہتا ہو۔ پھر اسے یوں لگا جیسے کوئی سیلن زدہ بوجھ کونوں کھدروں سے اس کی جانب خاموشی سے سرکتا چلا آ رہا ہے۔ وہ نڈھال سا ہو کر سرکنڈوں سے بنی چٹائی پر چت لیٹ گیا۔ مگر تھوڑی ہی دیر میں دوبارہ اُٹھ کر بیٹھ گیا اور بے قراری سے اپنی ہتھیلیوں کو مسلنے لگا۔ یہ سوچ اسے بار بار ڈس رہی تھی کہ عجیب و غریب نوعیت کی یہ سزا آخر اس کے لیے کیوں تجویز کی گئی ہے! فردِ جرم عائد کرنے کے بعد فیصلہ بھی سرپنچوں کو ہی سنانا چاہیے تھا۔ شاید وہ مجھے خود میرے ہاتھوں قتل کرانا چاہتے ہیں۔ انتقام لینے کا یہ کیسا بھیانک انداز ہے! یہ دوہری چال ہے، مکروہ سازش ہے۔ خود اپنے لیے سزا کا تعین کرنا کتنا جان لیوا مرحلہ ہوتا ہے اس بات کا تجربہ اُسے ہو رہا تھا۔

سب سے پہلے اس کی آنکھوں نے اس لڑکی کو دریا میں غوطے کھاتے ہوئے دیکھا تھا اور پھر اس کے دونوں پاؤں اندھادھند بھاگتے ہوئے دریا کنارے پہنچے تھے۔ اس کے بعد اس کے دونوں ہاتھوں نے بے اختیار آگے بڑھ کر دریا میں ڈبکیاں کھاتی لڑکی کو پکڑ لیا تھا اور اُسے اٹھا کر کنارے پر لے آئے تھے۔ مطلب یہ کہ اس کی آنکھیں، ہاتھ، پاؤں سب اس عمل میں برابر کے شریک تھے۔ مگر ان تینوں میں سے پہل کس نے کی؟ آنکھوں نے، نہیں! پیروں نے یا پھر شاید ہاتھوں نے؟ لیکن اس "غلطی" کی اصل ذمہ داری کس کے سر تھی؟ یقیناً اس کی آنکھوں نے اسے موت کے کنویں میں دھکیلا تھا۔ مگر آنکھیں تو بے بس تھیں۔ وہ تو صرف موقع کی گواہ تھیں۔ غلط قدم تو پیروں نے اٹھایا تھا کہ ایک دَم دوڑ پڑے تھے۔ لیکن اصل کام تو ہاتھوں نے ہی انجام دیا تھا۔ مان لیا کہ آنکھوں اور پیروں سے غلطی سرزد ہو گئی تھی لیکن کم از کم

ہاتھوں کو اس میں شریک نہیں ہونا چاہیے تھا۔ اگر وہ اس وقت رُک جاتے تو آج اسے ان جانکنی کے لمحوں سے تو نہ گزرنا پڑتا۔ مگر سچ تو یہ ہے کہ اس وقت کچھ سوچنے سمجھنے کی مہلت ہی نہیں ملی تھی۔ بس اندر سے حکم ہوا تھا اور اس نے جھٹ اس کی تعمیل میں لڑکی کو بچانے کے لیے دریا میں چھلانگ لگا دی تھی۔ کون تھا یہ حکم صادر کرنے والا!---دوسری طرف گزرتا ہوا ہر پل اور دل کی ہر دھڑکن اسے صبح کی جانب دھکیل رہی تھی۔ پہلی بار اسے صبح کے وجود سے شدید نفرت ہونے لگی اس کا اندر چیخ چیخ کر واویلا کرنے لگا کہ اے کاش باہر ایسی کالی آندھی امڈ پڑے کہ صبح ملتوی ہو جائے۔

رات کا پہلا پہر ختم ہونے کو تھا جب اس نے اپنے دونوں پیر کٹوانے کا ارادہ کر لیا اور قدرے پرسکون ہو گیا۔ مگر جب اچانک اسے شدید پیاس لگی اور وہ کوٹھری کے دوسرے کونے میں دو اینٹوں پر رکھی ملگجی سی صراحی میں سے پانی پینے کے لیے اٹھا اور چل کر وہاں تک پہنچا تو یکایک ایک سنسناہٹ بھری لہر اس کے پیروں کے تلووں میں سے رینگتی ہوئی اس کے سارے وجود میں پھیل گئی۔ اسی پل اس کی پیاس بھی ایک دم معدوم ہو گئی اور وہ الٹے قدموں دوبارہ سرکنڈوں کی چٹائی پر آ کر ڈھیر ہو گیا اور بے اختیار اپنے دونوں پیروں کو پیار سے سہلانے لگا۔ یہ سوچ کر اس کا دَم رکنے لگا کہ بغیر پیروں کے زندگی کیسے گذرے گی۔ فقط ایک قدم اٹھانے کے لیے دو بیساکھیوں کا سہارا لینا پڑے گا۔ یوں بھی جو کوئی اپنے پیروں پر کھڑا نہ ہو سکے اس کی مثال اس عمارت ایسی ہوتی ہے جو بنیاد کھودے بغیر کھڑی کی جا رہی ہو۔ ظاہر ہے وہ زیادہ دیر تک اپنی جگہ قائم نہیں رہ سکتی، زمین بوس ہو جانا اس کا نوشتۂ تقدیر ہے۔

رات کا دوسرا پہر تقریباً آدھا گزر چکا تھا اور وہ انتخاب کرنے کی اُدھیڑ بن میں غلطاں و پیچاں تھا۔ یکایک اس نے اپنے دونوں ہاتھ کٹوانے کا فیصلہ کر لیا۔ یہ فیصلہ اس کے لیے تنے ہوئے رسے پر بغیر کسی سہارے کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک چلنے کا مرحلہ تھا اور یہ اس وجہ سے اور بھی زیادہ خوف ناک شکل اختیار کر گیا تھا کہ نیچے گہراؤ تھا جس میں ناگ پھن اٹھائے شوکریں بھر رہے تھے اور بچھو اپنے زہریلے ڈنک لہرا رہے تھے۔ معاً اسے یوں

لگا جیسے سارے سانپوں اور بچھوؤں نے بیک وقت اس پر حملہ بول دیا ہو۔ وہ پاگلوں کی طرح اپنے دونوں ہاتھوں سے ان موذیوں کو اپنے بدن سے نوچ نوچ کر پرے پھینکنے لگا۔ اسی لمحے اسے اپنے دونوں ہاتھ کٹوا دینے کے فیصلے کی سنگینی کا علم ہو گیا۔ ایک بار تو اس دہشت ناک تصور سے ہی اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے کہ ٹنڈ منڈ بازوؤں کے ساتھ آدمی کتنا بے بس اور بے یار و مددگار ہو جاتا ہے۔ ہاتھ تو دو ایسے پتوار ہیں جو وجود کی ناؤ کو زندگی کے پر شور دریا میں سفر جاری رکھنے کے قابل بنائے رکھتے ہیں۔ ان کو کٹوانا، زندگی کی ناؤ کو بے پتوار کرنے کے مترادف ہے۔ تب، دونوں ہاتھ اس کے سامنے دو ایسے ورق بن گئے جن پر اس کی آنے والی زندگی کی پوری کہانی لکھی ہوئی تھی۔ اس نے پڑھا کہ ہاتھوں کے بغیر روٹی کے ایک لقمے اور پانی کے ایک گھونٹ کے لیے بھی اسے دوسروں کا محتاج ہونا پڑے گا۔ محتاجی اور بے بسی کی ایسی زندگی آدمی کو زمین پر رینگنے والے کینچوے سے بھی بدتر بنا دیتی ہے۔

رات کا تیسرا پہر آخری ہچکیاں لے رہا تھا جب اس نے اپنی دونوں آنکھیں نکلوا دینے کا حتمی فیصلہ کر لیا۔ یہ فیصلہ اس نے کافی سوچ بچار کے بعد کیا تھا۔ اس نے سوچا کہ ہاتھوں سے ٹٹول کر زندگی کسی نہ کسی طرح گزاری جا سکتی ہے بلکہ اگر ہاتھ میں چھڑی تھام لی جائے تو آدمی گڑھوں میں گرنے سے بھی بچ جاتا ہے اور کچھ نہیں تو کسی کا ہاتھ تھام کر بھی یہ سفر طے ہو سکتا ہے۔ کم از کم اس فیصلے کے نتیجے میں جسم کا ظاہری ڈھانچہ تو بہر طور سلامت ہی رہے گا۔ آنکھیں تو یوں بھی بڑی بھوکی ہوتی ہیں۔ ساری برائیاں، خواہشیں اور توقعات انہیں دو روزنوں کے راستے دل و دماغ میں جاگزیں ہوتی ہیں۔ آنکھوں کی روشنی کے بجائے دل کی روشنی سے کام لیا جا سکتا ہے۔ یہ سب سوچ کر اس نے رات بھر جاگی اپنی تھکی ہاری آنکھوں کو موند لیا۔ پھر شاید اس کی آنکھ لگ گئی۔ تب اچانک چڑیوں کے چہچہوں نے اس کی آنکھوں کے پپوٹوں کا پردہ اُلٹ دیا اور وہ ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا۔ کچھ لمحوں تک وہ خالی خالی نظروں سے سامنے دیوار کی جانب ایک تار دیکھتا رہا اور جب حواس کچھ بحال ہوئے تو اس کے جی میں پو پھٹنے کے منظر کو دیکھنے کی شدید خواہش تڑپ کر جاگ اُٹھی۔ وہ ایک عجیب سی بے خودی کے عالم میں

اپنے پیروں کو گھسیٹتا ہوا کوٹھری کے اکلوتے روزن کی جانب بڑھا۔ وہاں پہنچ کر اس نے ایڑیاں اٹھا کر بمشکل تمام روزن میں سے باہر جھانکا تو اس کے سامنے صبح کاذب کے بعد کا سحر انگیز منظر پھیلا ہوا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے بگلوں کی سفید براق ڈار سفید جھالر کی صورت اس کے سامنے سے گذری۔ یکایک اس کا سارا اندر ایڑیاں اٹھا کر اس کی آنکھوں کے روزنوں سے باہر جھانکنے لگا۔ چند لحظوں کے بعد نیم کے ایک گھنے درخت پر سے چڑیوں کا ایک جھنڈ یوں اوپر اٹھا جیسے کسی نے مٹھی میں بھرے چمکتے سکوں کو ہوا میں اچھال دیا ہو اور ٹھیک اسی لمحے اس پر یہ انکشاف ہوا کہ زندگی کی ساری رنگارنگی، شادابی اور دلکشی ان دو روشن کھڑکیوں ہی کی عطا ہے۔ ان سے محروم ہو کر زندگی سے سمجھوتہ کرنا بہت مشکل ہے۔ تب معاً دو دہکتی سلاخوں کو اپنی آنکھوں کی جانب بڑھتے تصور کر کے وہ خوف سے چیخ اٹھا۔ مگر پھر دوسرے ہی لمحے وہ زمین پر بیٹھ گیا اور اپنی آنکھوں کو دونوں ہاتھوں سے ڈھانپ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ جب اس کے آنسو تھمے تو اسے اپنے بدن سے کوئی چیز باہر کو سرکتی ہوئی صاف محسوس ہونے لگی، پھر ایک عجیب سی کپکپی نے اسے اپنے شکنجے میں کس لیا۔ اس کے بعد اس کے بدن میں چیونٹیاں سی رینگنے لگیں اور حلق میں پھندا سا پڑ گیا۔ اسے لگا جیسے جو چیز باہر کو آ رہی تھی وہ گلے میں پہنچ کر اٹک گئی ہے۔ اس کی پیشانی پر پسینے کے موٹے موٹے قطرے مردہ حروف کی صورت ابھر آئے، گردن کی طنابیں کھنچ گئیں اور پھر اس کا سارا وجود سن ہو گیا۔ عین اس وقت کوٹھڑی کے زنگ آلود آہنی دروازے کو کسی نے پورے زور سے پیچھے کی جانب دھکیلا۔ دروازہ درد سے کراہ اٹھا۔ بھاری بھرکم جوتوں کی آہٹیں کوٹھڑی میں یکے بعد دیگرے داخل ہوئیں۔ فیصلے پر عمل درآمد کرنے والوں کی سفاک آنکھوں نے اندر آ کر دیکھا کہ کوٹھڑی کے اکلوتے روزن کے بالکل نیچے، سل زدہ سنگی فرش پر گھٹنوں میں آنکھیں چھپائیں ٹانگوں کے گرداگرد مضبوطی سے ہاتھوں کا حلقہ بنائے وہ گچھو مچھو سا گٹھڑی بنا بے حس و حرکت یوں بیٹھا ہوا تھا جیسے اس کے اعضاء موم کے ایک گولے کی صورت باہم جڑ کر ایک ناقابلِ تقسیم اکائی میں ڈھل گئے ہوں۔ □□

سیّد محمّد اشرف

سیّد محمد اشرف ۱۹۵۷ء میں سیتاپور (یوپی) میں پیدا ہوئے۔ مارہرہ شریف میں ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد علی گڑھ یونیورسٹی سے بی۔ اے اور ایم۔ اے میں طلائی تمغات حاصل کیے۔ آجکل ''انڈین ریوینیوسروس'' کے انکم ٹیکس کے محکمے میں ڈپٹی کمشنر کے عہدے پر فائز ہیں۔ سیّد محمد اشرف بنیادی طور پر ایک افسانہ نگار ہیں تاہم انہوں نے مختصر اردو افسانے پر تنقیدی مضامین بھی لکھے ہیں۔ ان کے افسانوں کا مجموعہ ''ڈار سے بچھڑے'' ۱۹۹۴ء میں شائع ہوا۔ ان کی کہانیوں کے ترجمے ہندی اور انگریزی زبانوں میں آچکے ہیں۔ ''آدمی'' پر انہیں کتھاایوارڈ سے نوازا گیا ہے۔

آدمی

سیّد محمّد اشرف

کھڑکی کے نیچے انہیں گزرتا ہوا دیکھتا رہا۔ پھر یکا یک، کھڑکی زور سے بند کی۔ مڑ کر پنکھے کا بٹن آن کیا۔ پھر پنکھے کا بٹن آف کیا۔ میز کے پاس کرسی پہ ٹک کر دھیمے سے بولا۔

''آج تو کل سے بھی زیادہ ہیں۔ روز بڑھتے جا رہے ہیں۔''

سرفراز نے ہتھیلیوں پر سے سر اُٹھایا اور انوار کو دیکھا۔ ''تم نے تو دو ہی دن دیکھا ہے نا! میں تو بہت دن سے دیکھ رہا ہوں۔ کھڑکی بند رکھوں تو گھٹن ہوتی ہے کھول دوں تو دل اور زیادہ گھبراتا ہے۔ لگتا ہے جیسے سب ادھر ہی آرہے ہوں۔'' سرفراز چپ ہو گیا۔

پھر ایک لمحے کے بعد بولا۔

''آج تم سے اتنے برسوں کے بعد ملاقات ہوئی تھی تو دل کتنا خوش تھا کہ پھر یہ لوگ......''

''میں نے تمہیں سفر کا واقعہ بھی تو بتایا تھا۔ میں بھی صرف دو ہی دن سے تھوڑے ہی دیکھ رہا ہوں۔ ادھر گاؤں میں بھی آج کل یہی عالم ہے۔ کچھ اندازہ ہی نہیں ہو پاتا کیا ہوگا۔''

سرفراز نے چاہت بھری نظروں سے اپنے بچپن کے ساتھی انوار کو دیکھا جس سے آج پندرہ سال بعد ملاقات ہوئی تھی۔

دونوں کی بہت ساری یادیں ایک سی تھیں۔

جب وہ بہت چھوٹا سا تھا تبھی اپنے خالو کے گھر پڑھنے بھیج دیا گیا تھا۔ خالو کا گھر ایک بڑے دیہات میں تھا جہاں سے دو میل کے فاصلے پر بسے قصبے میں انٹر کالج تھا۔ وہیں پہلے ہی دن ایک ہم عمر لڑکے نے بہت بے تکلفی کے ساتھ اس کی ربڑ لے کر اپنی آرٹ کی کاپی پر غبارے نما پھول مٹا کر ایک لیمپ نما بطخ بنا کر اس کی ربڑ واپس کر دی تھی۔ حاضری کے وقت اس کا نام ہوا تھا۔

''سیّد انوار علی''...... ''حاضر جناب۔''

سرفراز دھیرے سے بولا۔

''سیّد انوار علی''

''حاضر جناب، تمہیں اسکول یاد آ رہا ہوگا۔''

''ہاں۔ تمہیں کیسے معلوم؟''

''یار تم اب ابھی پہلے کی طرح گھامڑ باتیں کرتے ہو۔ میرا پورا نام حاضری کے وقت ڈرائنگ ماساب کے علاوہ اور کون جانتا تھا؟''

سرفراز یہ سن کر مسکرایا حالانکہ گھامڑ والا جملہ اُسے بُرا لگا تھا لیکن وہ سوچ کر مطمئن ہو گیا کہ آج میں افسر کی اونچی کرسی پہ بیٹھا ہوں۔ میرا بچپن کا یہ دوست پرائمری اسکول میں اردو ٹیچر ہے۔ اپنے احساسِ کمتری پہ قابو پانے کے لیے اسے ایسے ہی جملے بولنے چاہئیں۔

پھر اس نے سوچا انوار ہی تو اسے اسکول سے واپسی پر حوصلہ دیتا تھا ورنہ قصبے سے دیہات تک پھیلے جنگل، سنسان باغوں اور خاموش کھیتوں میں ہو کر گزرنے میں اس کی روح آدھی رہ جاتی تھی۔ سرفراز نے سر کرسی کی پشت سے لگایا اور آنکھیں بند کرلیں اور بچپن کی اس دہشت کو یاد کیا اور اس یاد میں مزہ محسوس کیا۔

جاڑوں کے شروع میں چار بجے اسکول کی آخری گھنٹی بجتی۔ سب کے سب غل غپاڑہ کرتے تیزی سے نکلتے اور مست چال سے، بستے کندھے پہ ڈالے اپنے اپنے گھروں کو روانہ ہو جاتے۔ سرفراز کے دیہات کا کوئی بھی لڑکا کالج پڑھنے نہیں آتا تھا۔ وہ راستے کی دہشت کے خیال سے سہما سہما، دھیرے دھیرے قدموں سے کالج کے گیٹ سے باہر نکلتا۔ انوار کبھی اس کے ساتھ ہوتا کبھی نہیں ہوتا۔ جب ہوتا تھا تو تالاب تک چھوڑنے ضرور آتا تھا۔ تالاب سے آگے وہ بھی نہیں بڑھتا تھا کیونکہ تالاب کے بعد سڑک مڑ گئی تھی اور موڑ کے بعد پیچھے دیکھنے پہ قصبہ غائب ہو جاتا تھا۔ رخصت ہوتے وقت وہ اس کی ہمت بڑھاتا تھا۔

"تم ڈرنا مت سرفراز۔ نہر کی پٹری پار کرو گے تو باغ میں داخل ہونے پر کوئی نہ کوئی آدمی مل ہی جائے گا۔"

سرفراز اس کی طرف بے بس نظروں سے دیکھتا اور اس خیال سے کہ انوار پر اس کا ڈر ظاہر نہ ہو، چہرے پہ بہادری کے تیور سجا کر جواب دیتا۔

"نہیں ڈرنے کی کیا بات ہے۔ باغ میں کبھی کبھی آدمی مل جاتا ہے تو ذرا اطمینان رہتا ہے اور نہیں ملتا ہے تب بھی میں گھبراتا نہیں ہوں" یہ کہہ کر دیہات کی طرف چل پڑتا۔ دونوں پیچھے مڑ کر ایک دوسرے کو دیکھتے رہتے۔ سرفراز انوار کے اوجھل ہوتے ہی گردن کے تعویذ کو چھو کر محسوس کرتا اور جلدی جلدی آیۃ الکرسی پڑھنے لگتا۔ نہر کی پٹری پر مڑنے سے پہلے وہ چاروں قُل پڑھ کر اپنے سینے پر پھونکتا اور پھونک پھونک کر قدم رکھتا ہوا باغ کی طرف بڑھنے لگتا۔ یہ غروب کا وقت ہوتا تھا۔ سردیوں میں شامیں جلدی آجاتی تھیں۔ نہر کی پٹری پر مڑنے سے پہلے کچی سڑک پر اِکّا دُکّا آدمی سائیکل پہ آتے جاتے مل جاتے یا گھنٹیاں بجاتی بیل گاڑیاں

گزرتیں تو اسے تقویت کا احساس رہتا لیکن پٹری پہ مڑتے ہی بالکل سناٹا ہو جاتا تھا۔ اوپر شیشم کے درخت پہ بیٹھا کوئی گدھ شاخ بدلتا یا پر کھول کر برابر کرتا تو وہ آواز اس سناٹے کو اور ڈراؤنا بنا دیتی۔ اور یہی وہ وقت ہوتا تھا جب وہ آیۃ الکرسی بھول جاتا تھا۔ وہ قُل ہو اللہ پڑھنا شروع کر دیتا۔ اسی درمیان تیزی سے اوّل کلمہ طیّب بھی پڑھ لیتا۔

اور اب سامنے باغ آتا۔ آموں کا بوڑھا باغ۔ ڈوبتے سورج کی زرد روشنی میں کہرے میں لپٹا باغ جس کے اندر دوپہر کے وقت بھی سورج ڈوبنے والے وقت جیسا اندھیرا ہوتا تھا۔ کیونکہ ایک دن اتوار کو اس نے دوپہر کے وقت بھی یہ باغ دیکھا تھا۔ شام کے وقت یہ باغ بالکل بدل جاتا۔ لگتا جیسے سارے درختوں کی چوٹیاں آپس میں گندھ گئی ہیں۔ فجری کے درخت کے نیچے سے ہو کر گزرتے ہوئے اسے اپنے دل کی تیز تیز دھڑکن صاف سنائی دیتی۔ اسے لگتا جیسے جنات بابا درخت سے اب اترے۔

باغ سے نکل کر ایکھ کے کھیتوں کے پاس مینڈھ پر گزرتے ہوئے اسے محسوس ہوتا کہ ابھی ایکھ کے کھیت سے نکل کر بھیڑیا اس کی ٹانگ پکڑ لے گا۔ وہ پسینے پسینے ہو جاتا۔ پھر گیہوں کے کھیت آتے۔ پھر پلکھن کے درخت کے اوپر گاؤں کی مسجد کے منارے اور مندر کے کلس نظر آتے۔ تب آہستہ آہستہ اس کے بدن کا کھنچاؤ دور ہوتا تا ٹانگوں میں طاقت کا احساس پیدا ہوتا۔ پھر وہ بلند آواز میں کوئی فلمی گانا گانے لگتا۔

مہینے میں دو چار بار ایسا بھی ہوتا کہ باغ میں داخل ہوتے ہی اسے آدمی نظر آ جاتا جو عموماً پھاوڑا لیے جھونپڑی کی طرف جا رہا ہوتا تھا۔ اسے دیکھ کر گانا شروع کر دیتا۔ گانا بیچ میں روک کر وہ بہت اپنائیت کے ساتھ آدمی کو سلام کرتا۔

آدمی اس کا سلام سن کر پھاوڑا زمین پر رکھ کر آنکھیں مچمچا کر اسے دیکھتا۔

”رام رام بیٹا --- پٹواری ساب کے بھانجے ہو۔ انہیں ہماری رام رام بولنا۔“

وہ روزانہ اسی بھروسے پہ کالج سے گھر آنے کی ہمت کر پاتا تھا کہ شاید آج بھی آدمی مل جائے۔ اگر یہ آسرا نہ ہوتا تو وہ رو پیٹ کر کالج سے نام کٹا کر اپنے گاؤں واپس جا چکا ہوتا۔

لیکن آدمی روزانہ نہیں ملتا تھا۔ ایک دن کالج سے نکلتے نکلتے دیر ہوگئی۔ وہ گراؤنڈ پر والی بال کا میچ دیکھنے میں ایسا محو ہوا کہ وقت کا احساس ہی نہیں ہوا جب دیر کا احساس ہوا تو اس نے سورج کی طرف دیکھا جو آج قصبے میں ہی زرد ہوگیا تھا۔ وہ تیزی سے کالج کے گیٹ سے باہر نکلا اور دیہات کی طرف چل پڑا۔ نہر کی پٹری پر مڑتے ہی اس نے اپنے بدن میں یہ سوچ کر سنسنی محسوس کی کہ اب تو باغ سے آدمی بھی چلا گیا ہوگا۔ اس نے ماتھے کا پسینہ پونچھا اور شیشم کے درخت کے نیچے سے گزرا، درخت کے نیچے سے نکلتے ہی اسے ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی درخت اتر کر اس کے پیچھے چل پڑا ہو۔ پیچھے کی آہٹ اچانک تھم گئی۔ اسے لگا جیسے جنات بابا پیچھے سے اس کی کمر کا نشانہ لے کر جادو کی گیند مارنے ہی والے ہیں۔ اس نے تیزی سے کلمہ پڑھا اور کنکھیوں سے پیچھے دیکھا۔ وہ ایک بڑا بندر تھا جو چلتے چلتے اچانک رُک کر زمین پر دونوں ہتھیلیاں ٹیکے اس کی طرف دیکھ کر خرخر کر رہا تھا۔ اسے بندر سے بھی ڈر لگتا تھا لیکن جنات بابا کے مقابلے میں کم۔ اس نے اپنا بستہ بہت کس کے پکڑا اور باغ کے سامنے جا کر کھڑا ہوگیا۔ آج آگے کا راستہ بھی بند تھا اور پیچھے کا بھی۔ آگے سنسان باغ جس میں اب آدمی ہونے کی اسے کوئی اُمید نہیں تھی اور پیچھے بندر۔

سورج ڈوبے دیر ہو چکی تھی اور باغ کے درخت دھیمی آواز میں شام کی سرگوشیاں شروع کر چکے تھے۔ وہ باغ میں داخل ہوا۔ آگے بڑھا۔ بوڑھے فجری کے پاس سے گزرتے ہوئے اس کا دل زور سے دھڑکا۔ یہی جنات بابا کا اصلی گھر ہے۔

داہنی سمت سے آواز آئی۔ ''آج بہت دیر کی بیٹا۔''

ارے --- آدمی موجود ہے۔ اسے اتنی خوشی اس دن بھی نہیں ہوئی تھی جس دن انگلش والے ماسٹر صاحب نے ''مائی کاؤ'' لکھنے پر اسے ویری گڈ دیا تھا۔ اس نے آدمی کی طرف نگاہیں اٹھائیں۔ وہ جھونپڑی کے قریب درختوں کے پاس کہرے میں کھڑا تھا۔ اس نے غور سے دیکھا اس کا پھاوڑا اس کے ایک ہاتھ میں تھا جسے وہ زمین پہ ٹکائے ہوئے تھا۔ دوسرے ہاتھ سے وہ انگوچھے کو کانوں پہ برابر کر رہا تھا۔ کہرے میں لپٹا، دھوتی کرتا انگوچھا پہنے یہ آدمی اسے

حضرت خضر علیہ السلام کا نوکر لگا۔

"سلام" وہ چہک کر بولا۔

"جیتے رہو بیٹا۔ پٹواری ساب کو ہماری رام رام کہنا۔ اندھیرا مت کیا کرو۔"

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ گھر آکر کھانا کھا کے دالان میں بیٹھی خالہ کے کلیجے سے لگ کر اس نے انہیں پورا واقعہ سنایا۔ وہ چاہتا تھا خالو اور خالہ کو علم ہو جائے کہ اسکول کی پڑھائی کے علاوہ راستے میں واپسی کے لئے اسے کیسی جوکھم اٹھانا پڑتی ہے۔ مگر خالہ کو جب یہ معلوم ہوا کہ والی بال کے میچ کے چکر میں اسے دیر ہوئی تو وہ ہمدردی کے بجائے اُلٹا اسے ڈانٹنے لگیں۔

رات کو دالان میں رضائی سے بدن اچھی طرح لپیٹ کر اس نے سوچا اگر وہ آدمی مر گیا تو میں اسکول سے کیسے واپس آیا کروں گا۔ پھر یہ سوچ کر مطمئن ہوا کہ وہ آدمی دیکھنے میں تو خالو سے بھی چھوٹا لگتا ہے ابھی نہیں مرے گا۔

"سرفراز! تمہاری خالہ کی بیٹی کی شادی ہے۔ خالہ نے مجھے بُلا کر کہا کہ سرفراز تو ہمیں بالکل بھول گیا۔ تم اس سے جا کر کہو کہ خالہ اور خالو اسے دیکھنے کو بہت بے تاب ہیں اسے شادی میں ضرور آنا ہے۔"

سرفراز کو یہ سُن کر بہت ندامت ہوئی۔ وہ ندامت کے اس احساس کو چھپانا چاہتا تھا۔ اس نے سنجیدہ لہجے لیکن کھوکھلی آواز میں انوار کو بتایا کہ سرکاری ملازمت خصوصاً ذمہ داری کے عہدے پر کام کرنے میں بالکل فرصت نہیں ملتی۔ پھر اسے عائشہ کی یاد آئی، جسے اس نے اپنی گود میں کھلایا تھا۔ وہ کتنی جلدی اتنی بڑی ہوگئی۔

"شادی کب ہے؟"

"پرسوں بارات آئے گی۔"

"ارے۔ ان حالات میں تاریخ کیوں رکھ دی خالہ نے؟ تم نے دیکھا نہیں، کیسے دیوانے ہو رہے ہیں سب۔ لال بھبھوکا چہرے لئے ٹرکوں اور ٹریکٹروں پر جلوس نکال رہے ہیں۔ ہاتھوں میں ہتھیار اور کیسے نفرت انگیز نعرے......"

انوار اسے دیکھتا رہا۔ پھر بولا۔

"میں نے بھی خالہ سے کہا تھا کہ آج کل تقریب کرنے والا وقت نہیں ہے۔ گاؤں گاؤں میں وہ بات پھیل گئی ہے۔ خود انہیں کے گاؤں میں لوگوں کے لہجے بدل گئے ہیں۔ مگر خالہ کی بھی مجبوری ہے۔ خالو کے بھائی کے بیٹے سے رشتہ طے ہوا ہے جو تین دن بعد جدّہ واپس چلا جائے گا۔ خالو بھی اب بہت کمزور ہو گئے ہیں۔ اپنے سامنے عائشہ کے فرض سے سبکدوش ہونا چاہتے ہیں۔ تمہیں آج ہی چلنا ہوگا سرفراز۔ بھابھی کو فون کر کے تیار ہونے کو کہہ دو۔"

"کیا تم نے اخبار نہیں پڑھا انوار۔ پرسوں ریل گاڑی سے اتار کر......" وہ چپ ہو گیا۔
انوار بھی خاموش ہو گیا۔ پھر بولا۔

"اچھا تو بھابھی اور بچوں کو یہیں رہنے دو۔"

"ہاں۔ ان لوگوں کو نہیں لے جا پاؤں گا۔"

"گیارہ بجے ہیں---اگر بارہ بجے بھی کار سے چلیں تو شام چھ سات بجے تک خالہ کے ہاں پہنچ جائیں گے۔"

"ہاں۔ تقریباً ڈھائی تین سو کلو میٹر کا سفر ہے۔"

راستے میں نہر کے پُل پر اچانک کچھ لوگوں نے گاڑی کے سامنے آکر گاڑی روکنے کا اشارہ کیا۔ دونوں کے دل بیٹھ گئے کیونکہ بچاؤ کے لئے ان کے پاس کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ سامنے پُل پر ٹرک اور ٹریکٹروں کا جلوس آ رہا تھا۔ لوگ دیوانہ وار نعرے لگا رہے تھے اور ایک عجیب جذبے کے ساتھ آگے بڑھتے چلے آ رہے تھے۔

دونوں کے ذہنوں نے کام کرنا بند کر دیا۔ دونوں گاڑی میں بیٹھے رہے۔ جلوس برابر سے گزرتا رہا۔ گاڑی رُکوانے والے وہیں کھڑے نعروں کا جواب دیتے رہے۔ سرفراز نے آیۃ الکرسی یاد کی۔

جلوس گزر گیا تو وہ لوگ بھی زور زور سے کچھ باتیں کرتے جلوس کے ساتھ بڑھ گئے۔
سرفراز سخت ذہنی دباؤ میں تھا اس لئے گاڑی فوراً اسٹارٹ نہیں کر سکا۔ دونوں بیٹھے ایک

دوسرے کا ڈر محسوس کرتے رہے۔

سرفراز نے گاڑی اسٹارٹ کی تو انوار بولا۔

"کھلے عام سڑک پر اِکاّ دُکاّ آدمیوں سے کچھ نہیں کہتے۔ اِکاّ دُکاّ آدمیوں سے نپٹنے کے لئے شہر شہر گاؤں گاؤں لوگوں کو تیار کیا گیا ہے۔ پچھلے جمعے کو جب احمد شہر کی پٹری سے باغ کی طرف مڑا تو اچانک کسی نے پیچھے سے ......"

سرفراز کے بدن میں سر سے پاؤں تک سنسنی سی دوڑ گئی۔ وہ خالی ذہن کے ساتھ گاڑی چلاتا رہا۔ انوار بتاتا رہا۔

"اگر پورا جلوس اِکاّ دُکاّ آدمیوں پر حملہ کرے تو بدنامی بھی تو بہت ہوگی۔ ویسے اپنی طرف سے بھی تیاریاں ٹھیک ٹھاک ہیں۔" اس نے یہ بات رازداری کے لہجے میں بتائی۔

جب وہ نہر کی پٹری پر مڑے تو سورج ڈوب رہا تھا۔ سرفراز کو اپنا بچپن یاد آگیا۔ تب اسے یہ خاموش نہر، سنسان پٹری، اور سائیں سائیں کرتے باغ کتنے بھیانک لگتے تھے۔

اس نے اچانک گاڑی کے بریک لگائے۔ ہیڈ لائٹ کی روشنی میں ایک بڑا سا بندر ہتھیلیاں زمین پر ٹیکے ان کی طرف دیکھ کر خرخر کر رہا تھا۔ دونوں مسکرائے۔ بندر بھاگ کر درخت پر چڑھ گیا۔ اوپر کسی گدھ نے پہلو بدلا تو پھڑ پھڑاہٹ کی آواز ہوئی۔ سرفراز نے سوچا پہلے اس پھڑ پھڑاہٹ سے کتنا ڈر لگتا تھا۔

"تو یہ احمد دوکاندار والا معاملہ کب ہوا تھا؟"

"آج چار دن ہوگئے۔"

"ارے ......" سرفراز کی ہتھیلیاں اسٹیرنگ وہیل پر نم ہوگئیں۔

"کیا ہوا؟" انوار نے پوچھا۔ حالانکہ اسے معلوم تھا کہ کیا ہوا۔

"نہیں کچھ نہیں، یعنی ابھی بالکل تازہ واقعہ ہے۔ کچھ پتہ لگا؟"

"پتہ کیا لگتا۔ الٹے تھانے دار نے دفن کے بعد ہی سب کو ڈانٹا کہ جب ایسے حالات چل رہے ہیں تو سورج مُندے گھر سے باہر نکلنے ہی کیوں دیا۔ اندھیرے میں حملہ کرنے والوں کو

مار کر بھاگنے میں سہولت رہتی ہے۔"

پٹری سے اترتے ہی باغ سامنے آگیا۔

"گاڑی یہیں روک کر بیک کر کے لگادو۔ آگے راستہ نہیں ہے۔" انوار بولا۔

سرفراز نے گاڑی بیک کر کے لگادی اور باغ کے سامنے جاکر کھڑا ہو گیا۔

کہرے میں لپٹا باغ بہت دن بعد دیکھا تھا۔ آج اسے باغ سے کوئی خوف محسوس نہیں ہوا لیکن ایک عجیب ساسناٹا دونوں کے اندر خاموشی سے اتر آیا تھا جو باتیں کرنے کے باوجود ٹوٹ نہیں رہا تھا۔

دونوں جب جنات بابا والے پرانے درخت کے پاس سے گزر رہے تھے تو سرفراز نے اچانک رُک کر انوار کا ہاتھ اتنے زور سے دبایا کہ دُکھن ہڈیوں تک پہنچ گئی۔

انوار نے سرفراز کی طرف دیکھا۔ سرفراز نے آنکھ کے اشارے سے باغ کی بڑی مینڈھ کی طرف اشارہ کیا۔ انوار کو کچھ نظر نہیں آیا۔ اندھیرے میں وہ اس جگہ کا تعین بھی نہیں کرپایا جہاں سرفراز نے اشارہ کیا تھا۔

سرفراز نے اس بار اور بھی زیادہ زور سے ہاتھ دبایا اور اس کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑے پکڑے واپس مڑا اور کھینچنے والے انداز میں دوڑتا، گرتا، سنبھلتا باغ سے باہر نکلا۔ گاڑی میں انوار کو دھکیل کر گاڑی اسٹارٹ کی اور فل اسپیڈ پر نہر کی پٹری پر چڑھا کر پُل پار کر کے پکی سڑک پر آگیا۔ سرفراز شدید کھنچاؤ کے عالم میں گاڑی چلا رہا تھا۔ اس کا چہرہ ہولے ہولے کانپ رہا تھا اور پورا بدن پسینے سے شرابور ہو چکا تھا۔

"اب دور نکل آئے ہیں۔ بتاؤ تو سہی کیا بات تھی؟" سرفراز نے گاڑی روک دی۔

باغ کی مینڈھ پر درختوں کے درمیان ایک آدمی جُھکا کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں کوئی ہتھیار تھا جسے وہ زمین پر ٹکائے ہوئے تھا۔" ☐☐

غیاث احمد گدّی

غیاث احمد گدّی ۱۷ر فروری ۱۹۲۸ء کو جھریا (بہار) میں پیدا ہوئے۔ باقاعدہ تعلیم نہیں پائی، بلکہ ایک سال تک گدّی مدرسہ، جھریا میں مولوی فضل الحق سے عربی کی ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ بچپن میں جھریا کی ایک چھوٹی سی لائبریری کے ذریعے دل میں پڑھنے لکھنے کا شوق ہوا۔ ان کا پہلا افسانہ "دیوتا" ماہنامہ "ہمایوں" لاہور میں ۱۹۴۷ء میں شائع ہوا۔ "بابا لوگ" اور "پرندہ پکڑنے والی گاڑی" ان کے افسانوی مجموعوں کے نام ہیں اور "سارا دن دھوپ" ان کا ایک ناولٹ ہے۔ انہوں نے ۱۹۶۴ء میں "میراث" کے نام سے افسانوی ادب کا ایک ذاتی مجلّہ جاری کیا۔ افسانوی ادب میں انہیں ہمیشہ خوب سے خوب تر کی تلاش رہی۔ دل کے مریض تھے۔ ۱۹۸۶ء میں اسی مرض کے باعث دار فانی سے کوچ کر گئے۔

ڈوب جانے والا سورج

غیاث احمد گدی

رسّی تنی ہوئی تھی اور اس کے پاؤں توازن سے اس پر ٹکے ہوئے تھے اور دونوں ہاتھوں کو سیدھا کر کے ایک لمبی لاٹھی سے باندھ دیا گیا تھا، یوں جیسے پرواز کے وقت چیل کے پر دونوں رُخ سیدھ میں کھلے ہوتے ہیں۔

اور اب اس سے وہ لوگ کہیں گے کہ اس پر چلو ......

"تنی ہوئی رسی پر چلو۔ کرتب دکھاؤ!"

لیکن یہ سب وہ کر کیسے سکتا ہے؟ اس نے تو کبھی، کہیں ایسا نہیں کیا ہے۔ وہ رسی پر نہیں چلے گا۔ یہ کیا تک ہے؟ جس آدمی نے کبھی ایسا کام نہیں کیا اسے مجبور کرنا۔ وہ ہرگز ہرگز نہیں چلے گا ...... وہ چل بھی سکا تو نہیں چلے گا، کوشش کرے گا کہ گر پڑے، بلا سے چوٹ ......

لیکن !...... اسی وقت اس کی نظر نیچے جاتی ہے جہاں لکڑیاں جمع کی جا رہی تھیں۔ اب لکڑیوں میں آگ لگا دی جائے گی، اور اس نے ایک ذرا بھی غلطی کی یا اس کا توازن بگڑا، پاؤں پھسلا کہ لڑھک کر نیچے دہکتی آگ میں گر پڑے گا۔ اور......اور......

اُوپر سورج ترچھا ہو گیا تھا اور زرد بھی، اور مغرب میں جہاں ایک بہت اونچی عمارت تھی ٹھیک اس کے دائیں کونے میں اٹکا ہوا تھا، اور ذرا دیر اور گذر جائے گی تو سورج چپکے سے نیچے اتر جائے گا، اور اندھیرا......

اسے اندھیرے سے بہت ڈر لگتا تھا۔ اس کے باپ نے گال پر تھپڑ رسید کرتے کے بعد تاکید کر دی ہے کہ سانجھ ہوتے ہی وہ طویلے میں چلا جائے اور بھینسوں کی سانی لگائے، ان کا دودھ دوہے۔ مگر اسے اندھیرے سے بہت ڈر لگتا ہے اور طویلے میں تو دن کے وقت بھی تاریکی چھائی رہتی ہے۔ رات تو اور بھی تاریک ہوتی ہے۔ طویلے میں رات اور راتوں سے، باہر کی راتوں سے زیادہ سیاہ ہوتی ہے۔ اس پر صرف ایک کراسن تیل کی ڈھبری۔

وہ سہما سہما اندر جاتا۔ کسی طرح مدھم مدھم سی روشنی کے مختصر سے ہالے میں بھینس کو سانی لگاتا، اس کو چمکارتا اور لرزتے ہوئے پاؤں کو زبردستی جمانے کی کوشش کرتا ہوا بالٹی لے کر بھینس کے تھنوں کے قریب بیٹھ جاتا۔

اندھیرے میں اس کے ذہن سے نکل کر ایک سفید پتنگ دھیرے دھیرے فضا میں ڈول رہی ہوتی اور اس کے پیچھے پیچھے ایک کم سن بچے کی طرح، جو اچھی خاصی طرح بھاگ بھی نہیں سکتا ہے، نگاہوں کا جھگڑ لیے ڈولتا رہتا۔ اسے ہر لمحہ یہ احساس دامن گیر رہتا، کہ کوئی دوسرا لڑکا، جو اس کی عمر سے بڑا اور طاقتور بھی ہوگا، وہ کہیں سے اچانک آدھمکے گا اور اسے ایک جھانپڑ رسید کر کے اس کے جھگڑ کو توڑ مروڑ ایک طرف کو پھینک دے گا اور پتنگ کو لے بھاگے گا۔

اور تب وہ کیسے زندہ رہے گا۔ وہ سفید پتنگ جو اسے بھینسوں کے تاریک ترین طویلے

میں بھی بھٹکنے اور کھو جانے نہیں دیتی جب وہ چھن جائے گی تو وہ کیسے : نہ رہ سکے گا۔

اور تبھی اندھیرے میں ایک چھچھوندر تیزی سے اس کے پیروں کو چھوتے ہوئے ایک طرف کو نکل جاتی اور اس کا سارا لہو اچھل کر کنپٹیوں میں جمع ہو جاتا اور سانس دھونکنی کی طرح چلنے لگتی۔ ایسے میں کوئی اسے زور سے ڈانٹ دے تو شاید اس کا دم نکل جائے

بالکل ایسی ہی کیفیت تھی جب یہ لوگ اسے چوک سے ذرا پرے برتنوں کی دُکان کے پاس ملے تھے۔ وہ پانچوں عجیب عجیب شکلوں والے مرد اور دو عورتیں تھیں۔ پانچوں نے اسے پکڑ لیا۔

"اے فجوؔ کہاں چلا گیا تھا تو ؟"

"اے رتی تنی ہوئی چھوڑ کر۔" دوسرے نے کہا جو ایک دم اس کے سر پر کھڑا تھا۔ "تو تو پیشاب کرنے گیا تھا۔ تین گھنٹے ہو گئے۔"

وہ کبھی اس آدمی کو دیکھتا، کبھی اس آدمی کو۔ حیرت اور خوف کے زیر اثر اس کے سارے حواس شل ہو گئے تھے۔ وہ تو یہ بھی نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ فجوؔ نہیں ہے۔

وہ فجوؔ نہیں ہے۔

"اے یہ کپڑے..... ؟ ارے سخاوت اس فجوؔ کو دیکھا ابھی ابھی پیشاب کرنے جا رہا تھا تو اس کے کپڑے....."

اس کے جواب دینے سے پہلے دوسرے نے کہا "ارے فجوؔ بھاگ کہاں گیا تھا، کیا مفت کام کرتا ہے، تجھے بھی تو پانچ روپے ملتے ہیں --- چل وقت ہو گیا تماشے کا۔"

مگر وہ فجوؔ کہاں ہے؟ اس نے اپنی ساری بکھری بکھری قوت کو سمیٹ کر اکٹھا کیا اور دھڑکتے ہوئے دل پر ہاتھ رکھتے ہوئے منحنی آواز میں کہا۔ "میں میں فجوؔ....."

لیکن ان لوگوں نے ایک نہیں سنی۔ اس کی کمزور آواز ان کے کانوں تک پہنچی بھی نہیں اور وہ اندر ہی اندر لاکھ سمجھانے کی کوشش کرتا رہا کہ وہ فجوؔ نہیں وہ رفعت ہے۔ وہ اپنے خونخوار

باپ اور سخت گیر سوتیلی ماں اور ان دونوں سے زیادہ بھینسوں کے تاریک طویلے سے سہما سہما رہنے والا رفعت ہے جو آج جانے کیسے بہت سارے حوصلے سمیٹ کر گھر سے نکل بھاگا ہے اور......

اور وہ حضرت گنج کے چوراہے پر بہت دیر سے اِدھر اُدھر کٹی ہوئی پتنگ کی طرح ڈول رہا ہے کہ وہ کہاں جائے؟ کس کے یہاں چلا جائے؟ زبیدہ تو بہت دور رہتی ہے سیتاپور سے بھی آگے مسرولی میں، جب کہ سیتاپور جانے کے لیے بھی اس کے پاس پیسے نہیں، تین روپے آٹھ آنے تو چھوٹی بس ہی کے لگتے ہیں۔ اور اس کے پاس مشکل سے صرف آٹھ آنے ہیں۔ وہ کیسے زبیدہ کے پاس جا سکتا ہے۔

جانے کے لیے ---- اس کے پاس تین روپے آٹھ آنے چاہئیں۔ پھر ایک آدھ روپے کا گڑ بھی تو لینا ہوگا سیتاپور سے، پچھلی بار زبیدہ نے ٹوکا تھا۔ کیا خالی ہاتھ چلے آتے ہو بیوقوفوں کی طرح، کوئی یوں اپنوں کے پاس جاتا ہے؟ اور نہیں تو سیتاپور سے گڑ ہی لیتے آتا۔ کتنا اچھا ہوتا ہے۔

تین روپے آٹھ آنے وہ اور ایک روپے کا گڑ چار روپے اور آٹھ آنے جیب میں بجتے رہیں تو کتنا اچھا لگتا ہے۔ کل ملا کر پانچ ساڑھے پانچ روپے کا خرچ۔

پھر رفعت چونکا، اسے پانچ روپے ملیں گے؟ پھر اس نے پھیپھڑے کی ساری قوت لگا کر پوچھ ہی لیا "پانچ روپے۔"

"ارے ہاں، پانچ روپے بیٹا۔" پاس کھڑے بڑی بڑی مونچھوں والے آدمی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا، "تو کہے گا تو روپے آٹھ آنے اور مل جائیں گے ...... پر تو کام پر تو چل فجوے......!"

فجوے...... لیکن وہ تو رفعت ہے۔ وہ فجوے کہاں ہے۔ مگر وہ فجو نہیں ہے تو پانچ روپے بھی اسے کہاں ملیں گے؟

پھر کام۔ کیسا کام۔ وہ تو صرف ایک ہی کام کرنا جانتا ہے بھینسوں کو سانی لگانا، دودھ

دوہنا، گاہکوں کے یہاں دودھ پہنچانا، بس یہی، ایسے ہی کام۔ اس کے علاوہ اسے تو کچھ بھی نہیں آتا۔ حتیٰ کہ سائیکل چلانا بھی نہیں آتا۔

وہ اس تاریک طویلے سے نکل کر باہر آتا اور کبھی وکیل صاحب کے ٹانگ بھر کے لونڈے کو سن سن سائیکل چلاتا دیکھتا تو دنگ رہ جاتا۔ اتنا سا، بالشت بھر کا لمڈا کیسے سائیکل چلاتا ہے؟ سن سن —— ذرا نہیں ڈرتا۔ بڑی بڑی گاڑیاں سامنے آجائیں جنہیں دیکھ کر اس کا دل دھڑک اٹھتا ہے لیکن وہ لمڈا اس طرح ہنستا ہوا، جھومتا ہوا، ذرا ہینڈل کو ایک طرف دبا، راستہ کاٹ کر بڑی بڑی ٹرکوں سے صاف بچا لے جاتا ہے۔ اگر...... اگر اس کے ہاتھ میں سائیکل ہوتی تو وہ تو گیا تھا۔ خود بھی اور سائیکل بھی۔ دونوں کے دونوں ٹرک کے نیچے یوں پچک جاتے کہ بس......

ایک دن وکیل صاحب کا لونڈا عین اس کے قریب آکر کھڑا ہو گیا اور سائیکل سے اترا، ہنستے ہوئے بولا۔ ''کیوں بے رفو چلائے گا......؟''

''میں......؟'' وہ چونکا۔ ''کیا۔ سائیکل......؟''

''ابے ہاں چلائے گا تو بول......''

''مگر مجھے آتا نہیں شموّ بھیا۔''

''تو میں سکھادوں گا۔ گھنٹے دو گھنٹے میں۔''

''میں۔ میں...... شموّ بھیا...... میں...... مجھے نہیں آتا۔ شموّ بھیاّ مجھے تو بھینسوں کو سانی لگانے کے علاوہ کچھ بھی نہیں......''

''لیکن میں، میں کیا کام کرسکتا ہوں۔ مجھے تو کچھ بھی نہیں آتا۔ تماشے میں مَیں کیا کروں گا۔''

تبھی ایک نے آگے بڑھ کر اس کی گردن میں ہاتھ ڈال دیا اور محبت سے کھینچتے ہوئے لے چلا۔ ''تماشے میں وہی کرے گا جو روز کرتا ہے اور جو نہیں کیا تو کھائے گا کیا پانچ روپے نہیں ملے...... تو......''

پانچ روپے مل جائیں تو وہ مسرولی چلا جائے گا۔ بس میں بیٹھ کر۔ ذرا دیر کو گاڑی سیتاپور کو رکتی ہے۔ وہاں بس اسٹینڈ سے ایک روپے کا گڑ لے گا اور پانچ روپے تو بہت ہوتے ہیں۔ وہ سارا سارا دن بھینسوں کے آگے پیچھے لگا رہتا ہے۔ دودھ دوہتا ہے، سانی لگاتا ہے، گوبر پھینکتا ہے، بالٹی دھوتا ہے، پھر بھینسوں کو لے کر تالاب جاتا ہے۔ جب بھی اسے پانچ روپے تو کیا، پانچ آنے نہیں ملتے، مہینوں میں نہیں ملتے، سالوں میں نہیں ملتے۔ فقط عید کے عید ایک روپیہ ملتا ہے بس......

وہ پانچوں عجیب عجیب شکلوں والے آدمی اسے گھسیٹتے ہوئے بالآخر لے ہی آئے، عین چوک پر۔ جہاں دونوں طرف بانس کی قینچیوں کے درمیان ایک موٹی رسّی تنی ہوئی تھی، اور اس پر اسے چلنا تھا۔ نٹوں کا یہ تماشا وہ درگا پوجا کے موقع پر برابر دیکھتا تھا۔ بڑے تعجب اور اشتیاق سے اس کی آنکھیں کھلی رہتیں اور سانس رُک رُک کر چل رہا ہوتا۔ وہ لڑکے کو تنی ہوئی رسّی پر چلتے ہوئے دیکھتا اور جیسے ہی اس کے پاؤں لڑکھڑانے کو ہوتے وہ سہم جاتا اور اس کی تو جان ہی نکل جاتی۔

پھر یہی نہیں نیچے آگ بھی دہک رہی ہوتی کہ کہیں اس کے پاؤں لڑکھڑا کر رسّی پر سے پھسلیں تو وہ سیدھا دہکتی آگ میں۔ لونڈا آن کی آن میں جھلس کر رہ جائے گا۔

پھر یہی نہیں کہ لڑکا آرام سے چل رہا ہے، اس کے دونوں ہاتھ لمبی لاٹھی سے بندھے ہوئے ہیں اور آنکھوں پر پٹی بھی بندھی ہوئی ہے......اور......اور......

رفعت کو لگتا وہ لڑکا جس کی آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی ہے۔ اور جو رسّی پر سہم سہم کر چل رہا ہے اور......وہ خود......

وہ جب بھینسوں کے تاریک طویلے میں چل رہا ہوتا تو اسے احساس ہوتا ہے کہ اس کی آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی ہے اور وہ کسی تنی ہوئی رسّی پر چل رہا ہے۔ جانے اس کا دِل، طویلے میں جب تک رہتا دھڑکتا رہتا اور ہر لمحہ یہ احساس دامن گیر رہتا کہ کہیں اس کا پاؤں پھسلا تو وہ

نیچے دہکتی آگ میں گر پڑے گا۔ اور بے پناہ خوف اس کی پنڈلیوں میں دوڑ جاتا۔ دَم گھٹتا رہتا۔
تب ایک دن اس نے اپنے ابوّ سے کہا کہ وہ اندر طویلے میں نہیں جائے گا۔
"کیوں۔ کیوں۔ پھر بھینسوں کو......؟"
"بھینسوں کو سانی بھی نہیں لگاؤں گا۔"
"تو پھر کیا کرے گا۔ ماں کی ب...... میں جائے گا۔"
اس کے ابوّ نے اتنے زور سے ڈانٹ کر کہا تھا کہ وہ جو مہینوں کی دوڑ دھوپ کے بعد ذرا سی قوتِ گویائی سمیٹ پایا تھا سب بکھر گئی اور وہ سہم کر پھر خالی ہاتھ رہ گیا۔
اس کا ابوّ چارپائی پر سے اٹھا اور لہجے میں ذرا نرمی پیدا کر کے پچکار کے بولا۔
"پر کیوں نہیں؟ وجہ کیا ہے؟ کیوں نہیں جائے گا طویلے میں؟"
"مجھے ڈر لگتا ہے۔"
پھر تڑاخ سے ایک زوردار طمانچہ...... "سالے گدی کا بیٹا ہو کر......"
"کیا گدی کے بیٹے کو ڈر نہیں لگنا چاہیے......؟" عجب سوال تھا۔ اس نے اپنے آپ سے پوچھا اور سینکڑوں مرتبہ پوچھا، کیوں، گدی کے بیٹے کو کیوں نہیں ڈرنا چاہیے اور دوسروں کو کیوں؟
تبھی اسے زبیدہ کی بات یاد آئی۔ وہ اسے ریل کی لمبی پٹری پر دوڑنے پر آمادہ کرنے کی کوشش کرتی اور وہ گر پڑنے کی بات کرتا تو زبیدہ اسے ڈانٹ کر کہتی۔ ڈر، ڈر، رفو تو اِتنا ڈرتا کیوں ہے؟
کیوں؟ کیا میں اپنے آپ ڈرتا ہوں؟ اب کوئی زبیدہ ہی سے پوچھ لے کہ خود کیوں نہیں ڈرتی، یا یہ کہ وہ کیوں ہر دَم ہنستی رہتی ہے، تو زبیدہ کیا جواب دیتی۔
بہت دیر تک خاموش گردن جھکائے، فرش کی طرف نظریں گڑائے دیکھتے رہنے کے بعد زبیدہ زور سے ہنسی۔ اتنے زور سے کہ اس نے چونک کر دیکھا کہ کہیں وہ پتنگ غوطہ کھا کر اس کے

سر کے پاس سے تو نہیں گذر گئی۔

"کیا چونک کر دیکھ رہے ہو رفو......؟" زبیدہ نے تعجب سے اس کی جانب دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"پتنگ۔" بے اختیار اس کے منہ سے نکل گیا۔ پھر آپ ہی آپ شرمسار بھی ہو گیا کہ پتنگ کہاں تھی۔ وہ تو زبیدہ کی ہنسی تھی۔ زبیدہ اس کا جواب سن کر زور زور سے کھلکھلا کر ہنس پڑی اور بہت دیر تک ہنستے رہنے کے بعد یکایک خاموش ہو گئی اور اس کی طرف میٹھی نظروں سے دیکھتے ہوئے گویا سرگوشی میں بولی۔

"پتنگ چاہیے نا تمہیں۔ وہ سفید سفید پتنگ جو فضا میں ڈول رہی ہے؟"

"ہاں۔" وہ پھر بے اختیار ہو گیا۔ "بہت اچھی لگتی ہے مجھے......" اس نے گردن اُٹھا کر اوپر کھلے آسمان پر تیرتی ہوئی پتنگ پر نظریں گاڑ دیں۔ اور یوں پل کی پل میں ایسا کھویا کہ زبیدہ اس کی محویت کو کچھ دیر حیرت سے دیکھتی رہی۔ پھر ایک ہلکا سا ٹہوکا دے کر اسے چونکا دیا۔

"تو یوں نہیں ملنے کی...... یہ پتنگ......!"

"پھر کیسے ملے گی......؟"

"......................"

"پہلے میرے ساتھ اس پٹری پر دوڑو، پھر دیکھو۔" وہ یکایک پٹری پر چڑھ گئی۔ "یوں چڑھ جاؤ پھر یوں دونوں ہاتھوں کو پھیلالو، جیسے چیل اُڑنے کے وقت پھیلا لیتی ہے۔ ہاتھوں سے ہوا کو زور زور سے کاٹو جیسے چیل پَروں سے کاٹتی ہے۔"

زبیدہ تیز تیز ریلوں کی پٹری پر یوں دوڑنے لگی جیسے ہموار میدان میں بھی وہ نہیں دوڑ سکتا۔ دوڑتی دوڑتی وہ بہت دور نکل گئی۔ پھر ایک بار فضا میں دونوں ہاتھوں کو لہرایا، ہوا کاٹی اور اور چشم زدن میں مڑ گئی پھر...... بھاگتی بھاگتی اس کے قریب آ گئی۔

"یوں...... سمجھے۔"

یوں۔ یوں دوڑ کر چلنے سے سفید پتنگ تھوڑی مل جاتی ہے۔ وہ تو زبیدہ کی بکنے کی عادت ہے۔ یونہی بولتی رہتی ہے لیکن اس دن اس سے زبیدہ نے لاکھ چاہا کہ وہ پٹری پر دوڑے، مگر اس نے ایک نہیں سنی۔ وہ کیسے دوڑ سکتا ہے، وہ دوڑ ہی نہیں سکتا۔ خواہ مخواہ ہی میں گر جائے گا تھوڑی اڑے گی جھوٹ موٹ کی......

"کس کے سامنے تھوڑی اُڑے گی...... ؟ میرے سامنے نا؟" زبیدہ نے ایک دفعہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا۔ "دیکھو، میں کون ہوں؟"

"دیکھو......" وہ بہت دیر تک چپ رہا اور زبیدہ کے سوال کو سمجھ نہ سکا تو اس نے پھر اپنا سوال دہرایا...... "بتاؤنا میں کون ہوں......"

"زبیدہ...... اور کون...... ؟"

"ہاں۔ ہاں۔ زبیدہ تو ہوں ہی۔ لیکن تمہاری کون ہوں؟"

"پتہ نہیں۔" پھر اس نے رُک کر کہا۔ "ماموں کی بیٹی۔ میرے ماموں کی بیٹی ہو۔"

"سو تو ہوں۔ لیکن تمہاری کون ہوں؟"

زبیدہ میری کون ہے؟ بڑا مشکل سوال تھا۔ ماموں کی بیٹی بہن ہی ہوتی ہے۔ اور یہ بات تو زبیدہ بھی جانتی ہے۔ لیکن ماموں کی بیٹی تو خورشید آپا بھی ہیں، وہ ایسی کیوں نہیں ہیں، وہ کیوں دھتکار دیتی ہیں بات بات پر!

پر کوئی بھی ہو زبیدہ اس کی، لیکن وہ پٹری پر نہیں چل سکتا۔ وہ چل ہی نہیں سکتا، گر جائے گا۔ دانت منہ تڑوانا کیا عقل کی بات ہے؟

اس نے کہا۔ "میں چل ہی نہیں سکتا۔"

"کیوں نہیں چل سکتا؟" وہ بوڑھی عورت جو منہ میں بہت سارا پان دبائے ہوئے تھی، پچاک سے ایک طرف تھوک کر بولی۔ "آج کیا تجھے بچھو نے ڈنک مارا ہے......"

جیسے بچھو ڈنک مارتا ہے، ایسی ہی آواز میں چیخ کر بڑی بڑی مونچھوں والے آدمی نے کہا

"چلے گا تو تیرا باپ ورنہ سالے......"

وہ تڑپ کر اس کی طرف جھپٹا۔

"نہیں۔"

"کیوں نہیں؟" پاس والے دوسرے آدمی نے آگے بڑھ کر مونچھ والے کے ہاتھ تھام لیے۔ "یوں دھمکاؤ گے تو ڈر جائے گا۔ اور ڈر جائے گا تو چوک ہو جائے گی پھر سیدھے گر پڑے گا۔"

"ہاں۔ ہاں۔ ٹھیک کہتے ہو۔ چاچا۔" تیسرے نے تائید کی۔ "پیار سے چمکار کر کہو گے تو وہ ضرور چلے گا۔ کیوں بیٹا۔ چلے گا نا؟"

"تجھے اتنا پیار سے اتنی اپنائیت سے کہتی ہوں۔ جب بھی تو چلنے کو تیار نہیں ہوتا۔" زبیدہ ایک طرف کو روٹھ کر بیٹھ گئی۔ "جاؤ اللہ قسم تجھے، بات کی تو دو باپ کی پیدا۔"

زبیدہ کچھ دیر تک منہ پھلائے بیٹھی رہی اور وہ کبھی چمکتی ہوئی پٹریوں کو، کبھی زبیدہ کو تکتا، کبھی اپنے آپ کا جائزہ لیتا رہا۔ پھر کافی دیر ہوگئی اور زبیدہ نے پلٹ کر اس کی جانب بڑی میٹھی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے التجا جیسے لہجے میں پوچھا۔

"چلو...... چلو گے نا......؟"

اس نے آگے بڑھ کر زبیدہ کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھا۔ وہاں کہیں دور نیلے نیلے آسمان کی وسعتوں میں ہلکے ہلکے سفید بادلوں کے ٹکڑے جیسی کوئی چیز ہوا کے جھونکوں کے سہارے تیر رہی تھی اور اس کے آس پاس کوئی ایسی چمک تھی، ایسی دل میں اتر جانے والی چمک تھی کہ وہ بے خود سا ہو گیا اور غیر ارادی طور پر اس کی زبان سے نکل گیا۔

"ہاں چلوں گا!"

لپک کر اس بوڑھے نے، جس کی داڑھی سفید تھی اور دانت کالے تھے، اسے گلے سے لگا لیا اور گندے لعاب دار ہونٹوں سے اسے چوم لیا۔ "واہ فجو بیٹا، یہ ہوئی نا مردوں والی

بات......"

اب سورج کچھ اور ترچھا ہو گیا تھا۔ اوپر نیلے آسمان کے دامن میں لہو سا پھیل گیا تھا اور اس نے آنکھیں اٹھا کر دیکھا تو بلند عمارت سے ٹکا ہوا وہ بیمار بیمار سا سورج اسے ایسی نظروں سے گھور رہا تھا کہ اسے اس کا مفہوم ہی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

وہ کیا کہہ رہا تھا، وہ بیمار بیمار سا مرتا مرتا سورج جو کنارے پر، نیچے گہرائیوں میں گرتا ہوا اس کی طرف گھور گھور کر دیکھتا ہوا، اس سے کیا کہتا ہے وہ ٹھنڈا ٹھنڈا سا بجھا بجھا سا سورج، ہلکی ہلکی تھپکی دیتا ہوا اس کی آنکھوں میں، پھر دل میں اترا کیوں جا رہا ہے؟ اور وہ کیا کہنے جا رہا ہے۔ جاتے جاتے وہ کیا کہہ کر ہر روز نیچے ندی میں اتر جاتا ہے جو اس کی سمجھ میں نہیں آتا۔ وہ لاکھ کوشش کرتا کچھ پلّے ہی نہیں پڑتا ہے۔ "کیا کہتا ہے وہ روز ڈوبنے سے پہلے؟"

"کیا ڈوبنے سے پہلے سورج تجھ سے ہر روز کچھ کہتا ہے؟" زبیدہ نے حیرت سے اس کی جانب دیکھا۔

"ہاں۔ ہاں۔ زبیدہ، جانے مجھے ایسا لگتا ہے کہ وہ مجھ سے کہتا ہے، پر سمجھ میں نہیں آتا۔ اس کی نگاہوں میں جو بات رہتی ہے اور جو سیدھے بند مٹھی کی طرح میری آنکھوں میں، پھر دل میں اتر جاتی ہے، اس کا مفہوم ہی سمجھ میں نہیں آتا اور میں ندی کے کنارے بھینسوں کو ہانکتا ہانکتا سوچتے سوچتے ایک دم سے جھک جاتا ہوں۔ اور جبھی ......" وہ رک گیا۔

"اور جبھی کیا؟" زبیدہ نے حیرت اور انہماک سے پوچھا۔

"جبھی اندھیرا چھا جاتا ہے اور ......"

"اور کیا؟"

"اور جانے کیا ہو جاتا ہے کہ میری پنڈلیوں میں، رگوں میں کوئی کیچوا سا سرسرانے لگتا ہے اور دل بے طرح دھڑکنے لگتا ہے۔" اور وہ رک گیا۔ یوں چپ ہو گیا، جیسے بولنے کے لیے الفاظ نہ مل رہے ہوں۔ "اور تو چپ بیٹھا رہ جاتا ہے۔" زبیدہ جیسے غوطہ لگا کر تہہ سے موتی

اٹھالانے کی کوشش کرتی ہے اور کہتی ہے۔

''اور اگر میں تمہاری جگہ ہوتی تو ایک روز جھپٹ کر اسے اپنے ہاتھوں میں دبوچ لیتی اور اس وقت تک اسے ڈوبنے نہیں دیتی جب تک وہ اپنی بات صاف صاف مجھے سمجھا نہیں دیتا۔''

''سورج کو پکڑ لیتی؟''

''ہاں اور نہیں تو کیا...... اور ڈوبنے نہیں دیتی، کبھی ڈوبنے نہیں دیتی۔''

مگر سورج جو بہت دیر سے عمارت سے لگا ہوا تھا، رفعت نے دیکھا وہ دھیرے دھیرے نیچے اتر رہا ہے، ادھر، ...... جہاں ندی ہوگی، اور چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں ہوں گی وہاں آسمان کے دامن میں سرخی پھیل گئی ہوگی۔ ایسی سرخی جیسے کسی نے وہاں آگ لگا دی ہو۔

''آگ لگ گئی؟''

''ہاں لگ گئی۔'' بوڑھے کا جوان بیٹا جس نے کان میں سونے کی بالی پہن رکھی تھی اس نے کہا اور ایک بار اس کی جانب دیکھا۔ زور زور سے نگاڑا بجاتے ہوئے کہا۔

''فجوے، ذرا دیر اور بانس سے نکارہ...... ذرا دیر بس!''

ذرا دیر بس۔ اس کے بعد وہ سورج دھڑام سے نیچے پہاڑیوں کی گود میں گر جائے گا۔ اور تب اندھیرا۔

اس نے دہکتی ہوئی آگ کی طرف دیکھا اور ایک بار چاروں اور نظر گھما کر دیکھا۔ نگاڑے کی آواز سن کر آدمیوں کا ریلا سا آگیا تھا اور اسے چاروں جانب سے گھیر لیا تھا اور حضرت گنج کے اس رِکشا اسٹینڈ پر کھڑے سیکڑوں آدمیوں کی پر اشتیاق آنکھیں اسے گھور رہی تھیں، اور داد دینے کے لیے بیتاب تھیں۔ اور فضا آگ کی روشنی کے سبب گلنار ہونے لگی تھی۔

لیکن وہ تو فجو ہی نہیں، پھر کھیل کیسے دکھلائے گا؟

اور اب لوگ یہ کہیں گے کہ اس پر چل پڑو...... لیکن وہ کیسے چلے گا۔ وہ تو...... اس نے تو

کبھی ...... "مگر زبیدہ، میں تجھے کیسے بتاؤں، میں کبھی پٹری پر چلا ہی نہیں ہوں۔ میں کیسے چلوں گا۔" پریشانی سے اس نے کہااور ملتجی نظروں سے اس کی جانب دیکھنے لگا۔

"ایسے ہی جیسے میں چلتی ہوں۔"

"تم برابر چلتی آئی ہو۔ تمہیں تو......"

"میں نے بھی ایک نہ ایک دن شروع کیا تھا۔ اور تب میں سمجھ رہی تھی کہ میں گر پڑوں گی۔ مگر میں تمہاری طرح مری نہیں جارہی تھی۔ گر پڑوں گی تو گر پڑوں گی۔ اس میں مرنے کی کیابات ہے۔"

ہاں گر پڑوں گا تو گر پڑوں گا۔ اس میں ڈر سے مرے جانے کی کیا بات ہے؟...... پھر اسے پانچ روپے ملیں گے اور پانچ روپے مل جائیں تو وہ زبیدہ کے پاس پہنچ سکتا ہے۔

......اب سب ٹھیک ہے۔ ہاں سب کچھ ٹھیک ہے۔ اس نے ڈوبتے ہوئے آفتاب کی طرف دیکھا۔

"ہاں۔ سب ٹھیک ہے......جی؟"

مگر اس نے نظر اٹھا کر اوپر آسمان کی سمت دیکھا۔ وہاں عمارت سے ٹکا ہوا وہ افسردہ افسردہ سورج اُسے تک رہا تھا جیسے کہہ رہا ہو......

لیکن کیا کہہ رہا ہے وہ......؟ پھر اس نے سامنے تنی ہوئی رسّی کی جانب دیکھا۔ ابھی ابھی اس پر وہ چلے گا تو اس کے ننگے تلوؤں کے نیچے ہلکی ہلکی گدگدی ہوگی اور جیسے ہی اس کا بوجھ تنی ہوئی رسّی پر پڑے گا، رسّی آہستہ سے جھک جائے گی۔ پھر اس نے پورے اعتماد سے سورج کی طرف دیکھا اور سینکڑوں آدمیوں کو، اور خاص کر ان پانچ آدمیوں کو، جنہوں نے زبردستی اسے فجو سمجھ لیا تھا اور اسے کھینچ کر لے آئے تھے۔ ان کو بھی اور نیچے دہکتی ہوئی آگ کو بھی نظر انداز کر کے اور پنڈلیوں میں رینگنے والے کیچوے کو بھول کر آہستہ سے مسکراتے ہوئے اس نے اپنا ہاتھ بڑھایا اور دھیرے سے جیسے کوئی بیحد پیار سے سرگوشیوں میں کہتا ہے۔ اس نے

فرخندہ لودھی

فرخندہ لودھی ۲۵ر نومبر ۱۹۳۷ء کو پنجاب میں پیدا ہوئیں۔ پنجاب یونیورسٹی سے لائبریری سائنس سے ایم۔ لب اور اردو میں ایم۔ اے کی ڈگریاں حاصل کیں۔ نومبر ۱۹۹۷ء میں گورنمنٹ کالج لاہور سے چیف لائبریرین کے عہدے سے ریٹائر ہوئیں۔ اب تک ان کے دو ناول "حسرتِ عرض تمنا"، اور "پنجرہ"، اور افسانوی مجموعوں میں "شہر کے لوگ"، "رومان کی موت" اور "آرسی" منظر عام پر آ چکے ہیں۔ جیک لنڈن کی Call of the wild کا "ویرانے کی صدا" کے نام سے ترجمہ کیا۔ کہانیوں کے ترجمے کئی ملکی اور غیر ملکی زبانوں میں شائع ہو چکے ہیں۔ پنجابی اور اردو ادب اور سماجی مسائل پر ان کی تقریریں ریڈیو پاکستان سے نشر ہوتی رہتی ہیں۔ "واماندگیٔ شوق" فرخندہ لودھی کے پہلے افسانوی مجموعے "شہر کے لوگ" (۱۹۷۵ء) سے لیا گیا ہے۔

واماندگی شوق

فرخندہ لودھی

گوری چھوٹی سی تھی، دیکھنے والوں نے کہہ دیا، کمال کرے گی۔ میدہ سی رنگت اور چمک دار آنکھیں۔ اس کا باپ، بھاجی اس کی طرف سے بے فکر تھا کہ خوب صورت بیٹیوں کے بر تلاش کرنے میں دقت پیش نہیں آتی۔ ہاں حسن کا شعلہ بھڑکے اور بہتوں کو جلاتا خود دھویں میں بدل جائے تو والدین کا جینا دوبھر ہو جاتا ہے۔

اس کی ماں سیدھی سادی سی عورت تھی۔ گلیوں کے اندھیرے مکانوں میں پیدا ہوئی۔ وہیں بڑھی اور وہیں بڑھاپے کو عین اپنے عقب میں کھڑا پا رہی تھی۔

بھاجی سب سے نچلی منزل میں سیلی کوٹھری کے فرش پر لیٹا ہر وقت کھانستا رہتا۔ یا گرمی کے موسم میں صبح

ناک ہوتا ہے۔ شاید اسی لیے کہ دونوں کے ہاں بدن کی گرم بازاری ہے اور بدن زندگی کا وہ دلکش مگر دردناک پہلو ہے جو حیات کو احساسِ رنگ و بو اور لذّتِ نمو سے آشنا کرتا ہے۔ اسے بیماری نے وقت سے پہلے بوڑھا کر دیا تھا۔

نچلی کوٹھری کے اوپر ایک اور کوٹھری تھی۔ اس میں اس کا چھوٹا بھائی یونس اور اس کی بیوی اپنے چار بچوں کے ساتھ رہتے تھے۔ یونس کی کم عمر نازک سی بیوی چھت میں بنے ہوئے سلاخوں والے سوراخ میں کبھی کبھی منہ ڈال کر جیٹھ سے پوچھ لیتی۔

"بھا جی کی حال اے؟"

وہ ہر روز ایک ہی فقرہ دُہراتی۔ یا پھر بچے کے ہاتھ کوئی کھانے کی چیز بھیج دیتی اور یوں اس کی طرف سے ہم سائیگی کا رشتہ داری کا فرض ادا ہو جاتا۔ بھا جی کا چھوٹی بھابھی کے ساتھ بس اتنا سا تعلق تھا۔ اس کوٹھری کے اوپر تیسری کوٹھری میں بھا کی بیوہ بہن بیگاں رہتی تھی۔ اس کے دو بیٹے جوانی کی حدوں کو چھو رہے تھے۔ بیگاں زیادہ تر گم سم، دُکان داروں کے پراندے اور ازار بند بنتی رہتی۔ کبھی فرصت ملتی تو بھا کی پائینتی آ بیٹھتی اور بسورنے لگتی۔ پھر گھر بھر کی برائیاں کرتی۔ محلے بھر کے قصے سناتی۔

"تیری بیماری نال تاں میں دوہری دوہری اجڑ گئی ویرا"۔ بھا، اس کے اس رویے سے چڑچڑا ہو جاتا۔ بھلا جس بیوہ کے دو بیٹے ہوں اس کو رونے کی کیا حاجت ہے۔ بیٹے تو پیدا ہوتے ہی گھبرو سمجھو۔ پھر بھی روتی ہو تو حق کر لو۔ حق کر لینے میں کوئی حرج نہیں۔ ماں نے بھی تو ہم سب کے ہوتے ہوئے کر لیا تھا۔ ہم سے اکثر جوانی میں رنڈوے اور عورتیں بیوہ ہو جاتی ہیں۔ میں سوچتا ہوں کیا وجہ ہے؟ ماں بیوہ ہوئی۔ تم ہو اور ابھی تمہاری بھابی نیا---" بھا کی آواز بھرّا جاتی۔ گلیوں کا مرچیلا دھواں یکایک دونوں کی آنکھوں میں زیادہ چبھنے لگتا۔

"بیگاں---!"

وہ بات پلٹتا اور اپنی کسی ضرورت کا ذکر چھیڑ دیتا۔

"ماں نو آکھوں مینوں اک منجی پادیوے۔ ہڈیاں دکھ گیاں نیں، رب دی سوں!"

چارپائیوں پر سونے کا لطف آخری منزل والے اٹھاتے تھے، باقی اس خرچ سے بے نیاز تھے۔ اوّل تو پلنگ بچھانے کے لیے اتنی جگہ نہ تھی۔ پھر کھٹمل پڑ جائیں تو دھوپ کہاں سے دکھائیں۔ وہاں تو کئی انسانوں نے بھی سورج کو ڈوبتے نکلتے نہ دیکھا ہو گا۔ لیکن یہ فخر کیا کم تھا کہ وہ بڑے شہر کے باسی تھے۔

بھاکی بیوی نیما، اپنے تین بچوں کے ہمراہ چوتھی منزل میں مقیم تھی اور آخری منزل پر بھا کی ماں، گوری کی دادی اپنے مرد کے ساتھ رہتی تھی۔ یہ مرد گھر کی سب سے بڑی عورت کا شوہر تھا۔ کسی کا کچھ نہ لگتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ پیٹھ پیچھے اُسے سب "خصم" کے نام سے پکارتے۔ بھاکی چھوٹی بہن بانو کس کے ساتھ رہتی ہے، اس کا اندازہ بھا کو بھی تھا، وہ انہی پانچ منزلوں کے کونوں کھدروں میں کہیں پڑ رہتی۔

یہ مکان اصل میں ماں کے شوہر کے نام الاٹ تھا۔ گھر کے سب چھوٹے بڑے افراد اُسے "چاچا" کہہ کر مخاطب کرتے۔ شروع شروع میں "چاچا" بھا کو ایک آنکھ نہیں بھایا۔ پھر اس نے زندگی سے سمجھاؤ کرنا سیکھ لیا۔

ان ساری منزلوں کو، گھوم کر چڑھتی ہوئی سیڑھیاں آپس میں ملاتی تھیں۔ یا پھر چھت کا وہ سوراخ جو پانچوں کو پھاڑتا ہوا اوپر پہنچ گیا تھا اور وہاں سے روشنی چرا چرا کر بانٹتا رہتا تھا۔ ان بل کھاتی سیڑھیوں میں ہر منزل ایک پڑاؤ تھا۔ ہر پڑاؤ میں لوگ بستے تھے۔ "چاچا" ان سیڑھیوں میں دو بار نمودار ہوتا۔ صبح کام پر جاتے ہوئے اور شام کو واپسی پر۔

دراز قد کے اس بوڑھے کی کمر ابھی جھکی نہ تھی۔ وہ پگڑی سنبھالے ہوئے سیڑھیاں چڑھتا اترتا۔ اس کی بیوی کی بہوئیں اور بیٹیاں سر ڈھکتے ہوئے سرگوشیاں کرنے لگتیں۔

"نی خصم آگیا سو۔"

پھر کوئی بچہ چلا کر کہتا۔

اس گھر میں چاچے کی حیثیت اس سیڑھی کی سی تھی جو گھوم کر چڑھتی ہوئی پانچوں کمروں کو ملاتی تھی۔ سب سے الگ مگر سب کو ملاتی ہوئی اور ماں وہ سوراخ تھی جو اندھیری کوٹھریوں میں اُجالے کی کرنیں پہنچاتا تھا۔ وہ اوپر "مگ" کے منہ پر بیٹھی بہو بیٹیوں کی خبر گیری کرتی۔ نیما کے پوچھنے کے بعد بیگاں کی باری آتی اور پھر بلو کی۔

"نی بلو! کی حال ای پیٹ دا۔"

وہ چھوٹی بہو، بلو سے پوچھتی۔

بلو کے ہاں، شادی کے پانچ سالوں میں پانچواں بچہ آنے والا تھا اور وہ معدے میں درد کے مارے بلبلاتی رہتی تھی۔ بلو نام کی بلی تھی مگر مریل چوہیا کی طرح بہت کم اپنے بل سے باہر جھانکتی۔

بھا نے کئی بار یونس کو سمجھایا کہ اولاد کی آمد پر کنٹرول کرو۔ وہ اللہ رسول کے حوالے سے ہمیشہ ٹال جاتا: بھلا ہم کون ہیں روحوں کو دنیا میں آنے سے روکنے والے۔ واہ۔

جب ایک بلو سے کئی بلو ٹکڑے بن گئے تھے۔ اس بے چاری کو کون پوچھتا تھا۔ بلو کو گھر میں اپنا ایک ہی ہمدرد نظر آتا تھا وہ تھی جٹھانی نیما لیکن بیچ کی منزل میں چونکہ نندر ہتی تھی اس لیے دونوں کی آپس میں کم بات چیت ہو پاتی۔ ماں نے سوچ سمجھ کر کمروں کی تقسیم کی تھی۔ کم عمر بلو اکثر جٹھانی سے کہتی کہ بھابی! ماں خود میاں کے ساتھ سر پر چڑھ کر بیٹھتی ہے اور ہمارے درمیان اس چھنال کو چھوڑ دیا ہے۔ اللہ قسم بھابی، بیگاں راتوں کو اٹھ اٹھ کر چھت کا ڈھکنا اٹھا کر جھانکتی ہے۔ ہم تو سرِ شام بتی گل کر دیتے ہیں۔ سچ پوچھو تو بھابی میں نے آج تک منے کے باپ کا چہرہ غور سے نہیں دیکھا۔

نیما اس کے حسد کی آگ میں جھلسے ہوئے جذبات کو سمجھتی تھی۔ وہ بھی تو بھا کو کبھی جی بھر کے نہ دیکھ سکی۔ وقت ہی نہ ملتا تھا اور اب جب وقت ملا تو وہ بات نہ تھی۔ نیما، بھا کی طرف ہمدردی سے دیکھتی تو وہ مسکراتا ہوا خواہ مخواہ ہنسنے لگتا۔ یہ ہنسی کھانسی اور درد میں ڈوب جاتی اور

وہ ہانپتے ہوئے کہتا۔

"نیما تو میرے مرنے دے بعد حق کر لسیں۔ توں کوئی پڑھی لکھی تے نہیں ناں وچ کلیاں ویلاں نہیں لنگدا۔"

تیز طرار نیما کا جی چاہتا کہے ہم غریبوں کی بیٹیاں تو ہمیشہ اکیلی رہتی ہیں۔ گلر کے درخت کی طرح۔ اس میں پھل بہت آتا ہے کبھی پھول کھلتے کسی نے نہیں دیکھے۔ کہتے ہیں صرف دیوالی کی ایک رات اس میں پھول کھلتے ہیں، چوری چھپے۔ غریب کی بیٹی کی شادی کی رات بھی دیوالی کی ایک رات ہے۔ مسرت کی ایک لہر، جو دوشیزگی کے خواب محل کو ریزہ ریزہ کرتی گزر جاتی ہے اور باقی زندگی ان ریزوں کو چنتے اور جوڑتے کٹتی ہے۔

نیما نے گلر کے درخت کی دیوالی والی رات کی روایتی کہانی کہیں بچپن میں سنی تھی اور اب تجربات نے اس کو نئے معنی پہنائے تھے۔

بھا کو گھر میں پڑے رہ کر کڑھنے کے لیے قدرت لمبی عمر دیئے جا رہی تھی۔ اور گوری نے چودھویں برس میں قدم رکھ دیا تھا۔ بانو کے بیاہ کی کسی کو فکر نہ تھی۔ بھائیوں اور چاچا نے کبھی اس ضمن میں بات ہی نہ چھیڑی۔ یونس تمام وقت کمائی میں پھنسا رہتا۔ صبح سویرے دکان پر جانا اور شام کو دیا جلے واپس آنا اس کا معمول تھا۔ آتے ہی کھانا کھایا اوپر نیچے والوں سے حال پوچھا اور سو گیا۔

بلو جب بیاہی آئی تو یونس لونڈا سا تھا۔ علم کے نام اس نے کچھ نہ پڑھا لکھا تھا۔ ہاں دلالی کا فن اپنے بڑے بھائی سے بہت چھوٹی عمر میں سیکھ گیا۔ پھر جب چاچے نے پرزوں کے کباڑیے کی حیثیت سے دکان کھولی تو وہ اس کا دست راست بن گیا۔ یہ کام دلالی کی نسبت زیادہ نفع بخش اور آرام دہ تھا۔ لونڈے لپاڑے سکوٹروں کے سپیئر پارٹس چوری کر کے اس کے پاس لاتے اور وہ چوری کے کپڑے لاٹھیوں کے گز کے حساب سے خرید تا۔ بعض اوقات تو ایک دن میں ہفتے کی کسر پوری ہو جاتی اور اس روز وہ یہ قطب مینار سا گھر چھوڑ کر کسی کھلی اور فیشن

"میں چھاپا مارن آیاں بڈھیا۔"

"اے مائی ---"

اس نے ماں سے نفرت کے ساتھ پوچھا۔

"بانو کہاں ہے؟ بانو کہاں ہے؟" پورا گھر پوچھ رہا تھا۔ اور بھا وہ ساری گالیاں ماں کو اور چاچے کو فرداً فرداً سنا رہا تھا۔ جو اس نے سیکھی اور گھڑی تھیں۔

سیڑھیوں میں اتنا شور تھا جیسے چڑیا گھر کے سارے در ایک بالکونی میں کھل گئے ہوں۔ بانو نیما کے سہارے کھڑی بھا کو ٹکر ٹکر تک رہی تھی گویا وہ خود پاگل ہو یا اس کا بھائی۔

"بانو تو کبھی اوپر رہی ہی نہیں۔" نیما نے شوہر کو یقین دلایا۔ یونس اس کو سہارا دیتا چارپائی تک لے گیا۔ بھا کی پیشانی پر پسینے کی بوندیں تھیں اور وہ ہانپتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"سب چلے جاؤ۔ چلے جاؤ۔"

پھر ماں کی طرف متوجہ ہوا۔

"ماں! بانو کی شادی کر دے۔"

"کیسے کر دوں۔" ماں نے پوچھا۔

"کوئی چال چل۔ گوری کی بھی کر دے۔ میرے بعد نیما کو بھی۔ میں تو کہتا ہوں بیگاں بھی حق کر لے۔ اللہ رسول نے فرمایا ہے۔ ماں۔"

بھا کی سانس اکھڑ رہی تھی۔ اسے نمونیا ہو گیا تھا۔ صبح ہسپتال میں داخل کروانے کی کوشش کی۔ لیکن ڈاکٹر مریض کی حالت سے زیادہ تعلقات کو دیکھتے تھے اور ان لوگوں کے کسی اونچے آدمی سے کوئی مراسم نہ تھے۔

اگلے چند روز موت سر پر منڈلاتی رہی۔ رشتہ داروں کے دلوں میں جانے کیا ہو گا مگر ایک، دوسرے کے منہ سے نکلے ہوئے ذرا سے کلمہ بد کو پکڑ لیتا۔ حقیقت سے آنکھ ملانے کا حوصلہ سب میں نہیں ہوتا۔

نیما نے جانے کیا محسوس کیا اس کے چہرے پر غم کے آثار نہ تھے اور لوگ باتیں بناتے تھے۔ رسم کے مطابق اسے برے حالوں پھرنا چاہیے تھا۔ وقت کے لگائے زخم مندمل ہو جاتے ہیں مگر رسمیں زخموں کے داغوں کی طرح قائم رہتی ہیں اور لوگ ان داغوں کی بہار میں جینا پسند کرتے ہیں۔

بھا کی صحت نے ایک بار پھر سنبھالا لیا۔ ایک بار پھر وہ سب کو آسودہ حال دیکھنے کے لیے تجویزیں کرنے لگا۔ وہ اتنا بڑا بوجھ چھوٹے بھائی کے کندھوں پر چھوڑ کر نہیں مرنا چاہتا تھا۔ اور چاچا کے ساتھ تو صرف قانونی رشتہ تھا۔ انسان کے بنائے ہوئے قوانین پر زیادہ اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ وہ جانتا تھا۔

لڑکیوں کی شادی کا موضوع ہر وقت چھڑا رہتا تھا۔ بھا کو قدرت نے زندگی کی جو مہلت دی تھی وہ اسے اچھی طرح استعمال میں لا رہا تھا۔

بانو کے رشتے کی ایک جگہ بات چلی، لڑکے والے لڑکی کو دیکھنے آئے۔ ایک جھلک دیکھی اور فریفتہ ہو گئے۔ چند ہفتوں میں بات طے ہو گئی اور دن بھی مقرر ہو گیا۔

گوری ان ہی گلیوں میں پلی بڑھی دیکھی بھالی لڑکی، لڑکے تو کیا ان کی مائیں اس کی صورت پر عاشق تھیں۔ باپ کو جو رشتہ سب سے زیادہ مناسب لگا، اس سے حامی بھر لی۔ اب گھر میں شادی کے ہنگامے تھے۔ کبھی چاول چنے جاتے اور کبھی جوڑے ٹانکے جاتے۔ عورتیں کام کرتے ہوئے سہاگ گاتیں۔

"چنے دے اوہلے لاڈو کیوں کھڑی
میں کھڑی آں بابل جی دی آس
بابل بیٹی بر منگدی
چنے دے اوہلے لاڈو کیوں کھڑی
میں کھڑی آں ویرے جی دی آس

جوتی چرا کر لے گئیں تو وہ پلنگ پر لیٹا زہر خند اور بے چین سی ہنسی ہنستا رہا۔ اس نے جوتی کا مطالبہ کیا نہ لڑکیوں نے زیادہ چڑایا۔ گوری کا شوہر اندر بنا اترایا پھرتا تھا۔ بھا کو سراج کی حالت پر ترس آ رہا تھا۔ پھر سراج کونسا یوسف ثانی ہے۔ بھا نے دل کو تسلی دے لی۔ لیکن پاس بیٹھی بانو کی صورت روتے ہوئے اور زیادہ بھیانک دکھائی دیتی تھی۔ بھا نے یہ سب کچھ جانتے ہوئے بہن کو آباد کرنے کا پربندھ کیا تھا۔ اس کے لیے اسے اپنی گوری کی جوانی کا انتظار کھینچنا پڑا تھا۔

گوری کے حسن کو جوانی نے چار چاند لگائے۔ اس چکا چوند میں بانو کا کام بھی بن گیا۔ واقعی گوری نے کمال کیا تھا۔ پھوپھی کے رشتہ کی بات چلی، بھتیجی دکھا دی گئی۔ ایجاب و قبول بانو نے کیا۔ وہی سسرال گئی۔ بھا نے جاتے جاتے جوئے والی چال چلی تھی۔ جس میں پانسہ پلٹ جانے کا اسے یقین تو تھا مگر وہ یقین کو قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھا۔

پھر اس شام جب بانو روتی دھوتی گھر واپس آئی تو بھا نقاہت کے باوجود سراج کے پاس پہنچا اور اپنا صافہ اس کے قدموں میں ڈال دیا۔

"کچھ ترس کر سراجا۔"

وہ بچوں کی طرح بلک بلک کر رو دیا۔ اور اس نے بتایا کہ چند سال پہلے وہ تازہ دم جوان تھا۔ لوگ اس کے سائے سے ڈرتے تھے۔ پھر اس کے ساتھیوں نے اس کی بہن، بانو کو اغوا کر لیا اور اسے مسخ کر کے چھوڑ گئے۔ یہ لوگ کبھی اس کے دوست تھے۔ اصل میں ہم کچھ نہیں ہوتے، حالات ہمیں سب کچھ بنا دیتے ہیں۔

بھا نے جذباتی انداز سے سراج کا چہرہ ہاتھوں میں لے کر کہا۔

"اس کے بعد میں بدل گیا۔ میرا جی کمزور پڑ گیا۔ اس میں بانو کا کیا جرم ہے؟ تمہارا بھی کیا جرم تھا؟ اوہ میں نے ایک بار پھر غنڈہ گردی کی ہے۔ پر بانو بڑی اچھی لڑکی ہے۔ رب دی سوں۔"

وہ برابر کہے جا رہا تھا اور سراج کی آنکھیں بخیل کے سینے کی طرح جذبات سے خالی

تھیں۔ بھا چکرا کر گر پڑا۔

اسے گھر پر کون چھوڑ کر گیا۔ لیکن جب ہوش آیا تو اس کی چارپائی کے گرد کہرام مچا تھا۔ سب سے بلند آواز بانو کی تھی۔ بھا نے بانہیں پھیلا کر کہا۔

"میں ابھی مرا نہیں۔"

اور ساتھ ہی اسے ایسے محسوس ہوا جیسے اس کا گلا سڑا مردہ بیچ چوک دھرا ہے اور گلی کے مکانوں کے ہر منڈیر پر کوّے بیٹھے اپنی منحوس آواز میں چلاّرہے ہیں۔

"طلاق---طلاق---طلاق---"

سارا محلّہ ساری برادری، کائیں کائیں کرتی جمع ہوگئی تھی۔ اس کا یقین ہونے کے باوجود بھا، جی چھوڑ بیٹھا تھا، نیما نے نہایت سنجیدگی کے ساتھ اس کے کان میں ایک بات کہی۔ بھا کے مردہ چہرے پر مسکراہٹ کا اُجالا پھیل گیا۔

"چلو بھاگتے چور کی لنگوٹی ہی سہی۔"

وہ بڑبڑایا۔ پھر مرتے دم تک دُعائیں مانگتا رہا۔

"اللہ بانو کو بیٹا دینا۔ وہ زندگی بتائے گی۔" □□

قرۃ العین حیدر

قرۃ العین حیدر علی گڑھ میں پیدا ہوئیں۔ انگریزی ادب میں ایم۔ اے کی ڈگری حاصل کی۔ ان کے والد جدید مختصر افسانے کے بانیوں میں سے ہیں۔ والدہ اپنے زمانے کی مقبول ناول نگار تھیں۔ قرۃ العین حیدر کے افسانوں کے کئی مجموعے اور متعدد ناول شائع ہو چکے ہیں۔ ان کی بیشتر کتابوں کے ترجمے ہندوستانی و غیر ملکی زبانوں میں بھی شوق سے پڑھے جاتے ہیں۔ انہیں بڑی تعداد میں ادبی ایوارڈ ملے جن میں ہندوستان کا ایک نہایت اعلیٰ ایوارڈ "گیان پیٹھ" (۱۹۹۰ء) بھی شامل ہے۔ آجکل ساہتیہ اکادمی کی فیلو ہیں۔ انگلستان میں صحافی کی حیثیت سے کام کیا۔ تقریباً پوری دنیا کا سفر کر چکی ہیں۔ قرۃ العین حیدر کے فن کی بدولت اردو میں ایک نئے افسانوی رجحان اور رویے کو فروغ ملا۔

حسب نسب

قرة العین حیدر

لمبے چوڑے سیلے ہوئے غسل خانے میں دن کو بھی اندھیرا رہتا تھا۔ پیتل کے جھال پال تیتڑے، اونچا حمام، مٹکے، چوکی، رنگ برنگی صابن دانیاں، بیسن، اُبٹن، جھانوے، لوٹے، آفتابے، مگّے، کھونٹیوں پر غراروں اور میلے دوپٹوں کا انبار، آنولوں ریٹھوں سے بھری طشتریاں، اندھیرا خندرس مو اعلی بابا چالیس چور کا غار لیکن یہی غسل خانہ چھمّی بیگم کی دُکھی زندگی میں وقت بے وقت جائے پناہ کا کام دیتا تھا۔ اسی کی ہرے شیشوں والی بند کھڑکی کا رُخ چنبیلی والے مکان کی طرف تھا۔ اس کے ایک شیشے کا رنگ ناخن سے ذرا سا کھرچ کر چھمّی بیگم نے باہر جھانکنے کا انتظام بھی کر رکھا تھا کہ چھمّی بیگم کے لاڈلے ابن عم اجو بھائی چنبیلی والے مکان میں رہتے

تھے۔ پہروں وہ اس شیشے میں سے سامنے والے گھر کو اس طرح تکتیں جیسے شاہجہاں اپنے قید خانے میں سے تاج محل کو دیکھا کرتا تھا۔

اوسط درجے کے اس زمیندار خاندان کے آبائی گھر کے دو حصے تھے۔ باہر والا مردانہ حصہ جس کے صحن میں چنبیلی کی گھنی جھاڑیاں تھیں۔ ''چنبیلی والا مکان'' کہلاتا تھا۔ زنانے حصے کے آنگن میں املی کا سایہ دار درخت کھڑا تھا۔ اس لیے سارے محلے میں اس کا نام ''املی والا مکان'' پڑ گیا تھا۔ دونوں آنگنوں کی درمیانی دیوار میں آمد و رفت کے لیے ایک کھڑکی تھی۔

چھمی بی کے ابا اور اجو بھائی کے ابا ایک ساتھ رہتے تھے۔ چھمی بی کے پیدا ہوتے ہی اجو بھائی سے منگنی ہو چکی تھی۔ نو سال کی عمر میں منگیتر سے کا نا پردہ کرا دیا گیا تھا۔ اجو بھائی بلا کے خوبصورت اور کھلنڈرے تھے۔ اکلوتے لاڈلے بیٹے اور دو بھائیوں کے گھر کا واحد چراغ، اس لیے وہ تو جی بھر کے بگڑے۔ پتنگ بازی، کبوتر بازی، یہ بازی وہ بازی۔ لیکن بڑے ابا اور اماں کو اطمینان تھا کہ بیاہ ہوتے ہی سدھر جائیں گے۔ چھمی بیگم تو ہوش سنبھالتے ہی انہیں اپنا مجازی خدا سمجھنے لگی تھیں۔ ماں باپ کی اکلوتی وہ بھی تھیں۔ ان کے ناز بھی کم نہ اٹھائے جاتے۔ ضدی، غصیلی اور طنطنے والی چھمی بیگم سولہ سال کی ہوئیں تو شادی کی تاریخ مقرر کر دی گئی۔ دونوں طرف دھوم دھام سے تیاریاں ہونے لگیں کہ اچانک موت نے اس سکھی اور خوشحال گھرانے کی بساط الٹ دی۔ اس سال شاہجہاں پور میں جو ہیضے کی وبا پھیلی اس میں پندرہ دن کے اندر اندر چھمی بیگم کے اماں اور ابا دونوں چٹ پٹ۔ چھمی بیگم پر قیامت گزر گئی لیکن ابھی تایا تائی کا سایہ سر پر سلامت تھا۔ سب سے بڑی بات یہ کہ اجو بھائی سے بیاہ ہونے والا تھا۔ چھمی بیگم ماں باپ کا سوگ منانے کے بعد پھر مستقبل کے سہانے خواب دیکھنے میں مصروف ہو گئیں۔

شادی کچھ عرصے کے لیے ملتوی کر دی گئی تھی لیکن اس سے پہلے کہ بڑے ابا کوئی تاریخ مقرر کریں ان کا بیٹھے بٹھائے ہارٹ فیل ہو گیا۔

بڑے ابا کے مرتے ہی اجو بھائی نے کہا کہ وہ چند مقدموں کے معاملات سنبھالنے لکھنؤ جا رہے ہیں اور مصاحبوں کے ساتھ اڑنچھو ہوئے۔ اب املی والے مکان میں رہ گئیں بڑی اماں

جو بالکل باؤلی ہو رہی تھیں اور چھمیّ بیگم۔ مردانہ سونا ہو گیا۔ ڈیوڑھی پر پرانے ملازم دھمو خاں ڈنڈا سنبھالے بیٹھے رہ گئے۔ اندر سلامت بوا اور ان کی لڑکیاں روتی ناک سنکتی کھانا پکانے میں جتی رہتیں۔ گھر کی حفاظت کے لیے بڑی اماں نے ایک بوڑھے رشتے دار ملّن خاں کو بریلی سے بلوا بھیجا جو چنبیلی والے مکان کے دالان میں کھٹیا ڈال کر پڑ رہے۔

اجوّ بھائی لکھنؤ گئے تو وہیں کے ہو رہے۔ ہر خط میں اماں کو لکھ بھیجتے کہ مقدمے کی تاریخ بڑھ گئی ہے۔ مہینے دو مہینے میں آ جاؤں گا۔ پورے چھ مہینے بعد واپس آئے تو بڑی اماں نے شادی کا ذکر چھیڑا۔ بولے جب تک زمینوں کے معاملات نہیں سدھر جاتے میں شادی وادی نہیں کرنے کا۔

جبھی سے چھمیّ بیگم تاریک غسل خانے کے کونے میں میلے کپڑوں کے ڈھیر پر بیٹھ کر چپکے چپکے رونے لگیں۔

اب چھمیّ بیگم اُنیس سال کی ہو چکی تھیں۔ اجوّ بھائی نے شاید طے کر لیا تھا کہ لکھنؤ ہی میں رہیں گے۔ لوگوں نے آ کر بتایا تھا کہ وہاں خوب رنگ رلیاں منا رہے ہیں۔ چھمیّ بیگم بھی نہ جانے کیسا نصیب لے آئی تھیں۔ ایک دن بڑی اماں پر دل کا دورہ پڑا اور وہ بھی چل بسیں۔

اب چھمیّ بیگم تن تنہا حق حیران رہ گئیں۔ آنگن میں الّو بولنے لگا۔ مزید حفاظت کے خیال سے اندھے دھندے ملّن میاں چنبیلی والے مکان سے املی والے مکان میں منتقل ہو گئے۔ ادھر دالان میں پڑے وہ کھانسا کرتے، ڈیوڑھی میں دھمو خاں کھانستا رہتا۔

اجوّ بھائی ماں کے مرنے میں آئے تھے۔ تیجا کرتے ہی واپس چلے گئے۔ کس طرح انہوں نے بیچ منجدھار میں چھمیّ بیگم کا ساتھ چھوڑا۔ اللہ اللہ! جب وہ یہ سب سوچتیں تو کلیجہ پھٹنے لگتا۔ مہینے کے مہینے لکھنؤ سے دو سو روپے کا منی آرڈر آ جاتا یا کبھی کبھار ملّن خاں کے نام خیر خبر پوچھنے کا خط۔

ملّن خاں کی بیوی اور بیٹی بھی بریلی سے آ گئی تھیں لیکن اپنی تنگ مزاجی کی وجہ سے چھمیّ بیگم کی ان دونوں سے ایک دن نہ بنی۔ دن بھر رشتے داروں سے لڑنے جھگڑنے یا آپ ہی آپ تلملانے اور کلپنے کے بعد چھمیّ بیگم پھر غسل خانے میں گھس جاتیں اور روتیں یا شاہجہانی

شیشے میں سے چنبیلی والے مکان کو تکا کرتیں۔ یہ زندگی بھی کیسی زندگی ہے! وہ سوچتیں۔ ابھی سب کچھ ہے ابھی کچھ بھی نہیں۔ کل کی بات معلوم ہوتی ہے کہ اس گھر پر کتنی رونق تھی۔ دالان میں آرام کرسیاں پڑی ہیں۔ صحن میں مونڈھے بچھے ہیں۔ گیس کے ہنڈے سنسنا رہے ہیں۔ ابا اور بڑے ابا کے دوستوں کی محفل جمی ہے۔ مشاعرے ہو رہے ہیں۔ قوال گا رہا ہے۔ جب اجو بھائی کے دوست احباب آتے تو اجو آنگن والی کھڑکی میں آکر کھنکارتے اور ایک مخصوص آواز میں آہستہ سے پکارتے۔

"ارے بھئی چھمو! ذرا چائے تو بھجوا دو۔"

اس بھرے پُرے گھر کو کس کی نظر کھا گئی؟

اپنی اس شدید یاس و ناامیدی کے باوجود چھمی بیگم کو یقین تھا کہ ایک نہ ایک دن اجو واپس آئیں گے۔ چنبیلی والا مکان پھر آباد ہو گا۔

جمعے کے جمعے وہ مردانے مکان میں جاتیں۔ دھموّ خاں اور سلامت بوا کی لڑکیوں کے ساتھ مل کر باغ کے جھاڑ جھنکاڑ کی صفائی کرواتیں۔ دالان کے جالے صاف کیے جاتے۔ اندر کے کمرے مقفل تھے۔ دروازوں کے شیشوں میں سے جھانک کر وہ بڑے ابا، ابا اور اجو کے کمروں پر نظر ڈالتیں اور سر ہلاتی، ٹھنڈی آہیں بھرتی واپس آجاتیں۔

چھمی بیگم تیس سال کی ہو گئیں۔ بال وقت سے پہلے سفید ہو چلے۔ اب انہوں نے چنبیلی کے باغ کی دیکھ بھال بھی چھوڑ دی۔ دل دنیا سے اُچاٹ سا ہو گیا لیکن غصے اور طنطنے کا عالم وہی رہا بلکہ اب عمر کی پختگی کے ساتھ اس میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

ان کی اس تمکنت اور طنطنے کے لیے وجوہات کچھ کم نہ تھیں۔ ماں باپ خالص اصل نسل روہیلے پٹھان، دادا پر دادا ہفت ہزاری نہ سہی ایک ہزاری، دو ہزاری (یا نگوڑے جو کچھ بھی وہ ہوتے تھے) ضرور ہی رہے ہوں گے۔ سارے کنبے کا سرخ و سپید رنگ اور پٹھانی خودداری اور غصہ اس حقیقت کا کھلا ثبوت تھا کہ اس خاندان میں کھبیل کبھی نہ ہوئی۔ ماضی کے ان جغادری روہیلہ سرداروں کے نام لیوا اس کنبے کے حسب نسب پر کوئی آنچ نہ آنے پائے اس فکر میں وہ بالکل قلعہ بند ہو کر بیٹھ رہیں۔ محلے کی عورتوں سے ملنا جلنا بھی کم کر دیا۔ بیواؤں کے

سے سفید کپڑے پہننے لگیں۔ ان کا زیادہ وقت مصلے پر گزرتا۔ اکثر دوپہر کے سناٹے میں سلامت بوا آنگن کی کھڑکی میں بیٹھ کر زردہ پھانکتے ہوئے بڑی ڈراؤنی آواز میں آپ سے آپ بڑبڑاتیں "---باری تالا فرماتا ہے مجھے دو وخت اپنے بندوں پر ہنسی آتی ہے۔ ایک جب جسے میں بنا رہا ہوں اسے کوئی بگاڑنے کی کوشش کرے اور دو جب جسے میں بگاڑ رہا ہوں وہ اپنے آپ کو بنانے کی کوشش کرے، بس دو وخت---" اور چھمی بیگم دہل کر ڈانٹتیں۔ "اے سلامت بوا! نحوست کی باتیں مت کرو۔" لیکن سلامت بوا اطمینان سے اسی طرح بڑبڑاتی رہتیں۔

اس روز نوچندی جمعرات تھی۔ چھمی بیگم غسل خانے میں نہا رہی تھیں۔ سردیوں کا زمانہ تھا، حمام کے نیچے سلگتے انگارے کب کے بجھ چکے تھے اور چھمی بیگم کو کپکپی سی چڑھ رہی تھی۔ جلدی سے بال تولیہ میں لپیٹ کر کھڑاویں پہن رہی تھیں۔ جب باہر سے سلامت بوا کی سڑبلی نواسی نے زور سے غسل خانے کے دیمک لگے کواڑ کی کنڈی کھڑکھڑائی۔ "آپا! اے آپا! جلدی نکلو۔"

"ارے کیا ہے باؤلی؟" چھمی بیگم نے جھنجلا کر آواز دی۔

"آپا! چنبیلی والے مکان میں آپ سے کہا ہے کہ چار پانچ جنوں کے لیے چائے بھجوا دو جلدی۔"

"کیا---کیا؟" چھمی کو اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔ انہوں نے جلدی سے شاہجہانی شیشے سے آنکھ لگا دی۔

صحن کا پھاٹک کھلا ہوا تھا۔ باہر دو تانگے کھڑے تھے۔ دو تین لُقندرے سامان اُتروا رہے تھے۔ ایک سیاہ فام لیکن تیکھے نقش والی عورت سرخ جارجٹ کی ساڑھی پہنے ہری بنارسی شال میں لپٹی دالان میں مونڈھے پر بیٹھی اطمینان سے گھٹنے ہلا ہلا کر نوکروں کو احکام دے رہی تھی۔ ایک اس کی ہم شکل تیرہ چودہ سالہ تڑی شکل والی اُچھال چھکا سی لڑکی کاسنی شلوار قمیض پہنے فرش پر اکڑوں بیٹھی ایک بکس کھولنے میں مشغول تھی۔ اتنے میں اندر سے اجو بھائی---جی ہاں، ہمیشہ کی طرح بانکے چھبیلے اجو بھائی دالان میں آئے۔ جھک کر اس لال چڑیل سے کچھ کہا۔ وہ قہقہہ لگا کر ہنسی۔ چھمی بیگم کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ نیم تاریک غسل خانہ اب

بالکل اندھا کنواں بن گیا۔ انہوں نے جلدی سے ایک کھونٹی پکڑلی، لڑکھڑاتی ہوئی باہر آئیں اور بے سدھ ہو کر اپنے بستر پر گر گئیں۔

بات یہ تھی کہ اجو بھائی، جنہوں نے برسوں سے لکھنؤ والی کلو کو گھر ڈال رکھا تھا۔ اب باقاعدہ نکاح کر کے اسے اپنے ساتھ لے آئے تھے۔ کاسنی شلوار والی لڑکی اشرفی کلو اپنے ساتھ لائی تھی، اجوّ بھائی کی نہیں تھی۔

شام کو اجوّ بھائی پردہ کروائے بغیر درّانہ زنانے میں چلے آئے اور دالان میں پہنچ کر پکارا۔ "ارے بھئی، چھمّو---- آؤ اپنی بھابی سے ملو۔"

چھمّی بیگم کانپ کر رہ گئیں۔ پلنگ سے اٹھ کر پھر غسل خانے میں جا گھسیں اور زور سے چٹخنی چڑھادی۔ اجو بھائی ذرا چور سے بنے دالان کے ایک در میں کھڑے رہے۔ کلو ان کے پیچھے کھڑی تھی۔ دونوں میاں بیوی چند منٹ تک اسی طرح چپ چاپ کھڑے رہے اور پھر سر جھکائے چنبیلی والے مکان واپس چلے گئے۔

اس دن کے بعد سے چھمّی بیگم کی دنیا بدل گئی۔ اب وہ سارا دن قرآن شریف ہی پڑھا کرتیں۔ اجوّ نے انہیں اتنے برسوں ہوا میں معلق رکھ کے ان کی زندگی تباہ کر کے کسی اور سے شادی کر لی۔ اس ناقابل برداشت صدمے سے زیادہ دہشت انہیں اس بات کی تھی کہ انہوں نے کلو بائی طوائف سے نکاح کر کے خاندان کا حسب و نسب برباد کر دیا۔ چھمّی بیگم اس جرم کے لیے انہیں مرتے دم تک معاف نہ کر سکتی تھیں۔ کلو نے کئی بار ان کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا۔ اکثر وہ آنگن کی کھڑکی میں آہستہ سے کہتی۔ "بٹیا! کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتادیجئے۔" کبھی کوئی خاص کھانا پکتا تو نوکر کے ہاتھ سینی بھجواتی لیکن چھمّی بیگم نے دھمّو خاں کو حکم دے رکھا تھا کہ چنبیلی والے مکان سے کوئی چڑیا کا بچہ بھی اس طرف آئے تو اس کی ٹانگیں توڑ دو۔ گھر واپس آنے کے دوسرے مہینے اجو بھائی نے ملّن خاں کے ہاتھ دو سو روپے بھجوائے جو وہ اب تک لکھنؤ سے بھیجا کرتے تھے۔ لیکن اب صورت حال بدل چکی تھی۔

چھمّی بیگم کھڑکی میں جا کر للکاریں۔ "جمعہ خاں مرحوم کی بیٹی اور شبو خاں مرحوم کی بھتیجی چکلے سے آیا ہوا ایک پیسہ بھی اپنے اوپر حرام سمجھتی ہے! ملّن خاں! غیرت والے پٹھان ہو تو جا کر

یہ دو سو روپلی بھیجنے والوں کے منہ پر دے مارو۔" یہ رجز پڑھ کر انہوں نے کھڑکی کا دروازہ بند کیا اور اس میں یہ موٹا قفل ڈال دیا۔

اب چھمّی بیگم اپنے زیور بیچ کر گزر بسر کرنے لگیں۔ زیور ختم ہو گئے تو گھر کا قیمتی پرانا سامان کباڑی کے ہاتھ فروخت کر ڈالا۔ لیکن بھوک ایک دائمی مرض ہے جس کا وقتی علاج کافی نہیں اور چھمّی بیگم کو دھمّو خاں، ملّن خاں، سلامت بوا اور ان کے چینگڑو پوتوں کا پیٹ بھرنا تھا۔ انہوں نے گھر میں قرآن شریف اور اُردو پڑھانے کے لیے بچیوں کا مکتب کھول لیا۔ محلے والوں کی سلائی کرنے لگیں۔ جب محنت کرتے کرتے بیمار پڑ گئیں اور ہلہلا کر بخار چڑھ آیا تو سلامت بوا ہڑبڑا گئیں اور غصّے سے بولیں۔ "بی بی! کیا آن پر جان دے دو گی؟ ایسی بھی کیا نگوڑی آن!" لیکن چھمّی بیگم پر غنودگی طاری تھی۔ سلامت بھاگی بھاگی چنبیلی والے مکان پہنچیں۔

کلّو فوراً سر پر برقع ڈال گلی کے راستے اندر آئی۔ ڈاکٹر بلایا گیا۔ کلّو ساری رات نند کی پٹی سے بیٹھی رہی۔ اجو بھائی نے کئی بار آکر دکھیاری چچازاد بہن کی حالت دیکھی لیکن شاید اب بھی اس بے انصافی کا احساس انہیں نہ ہوا جو انہوں نے چھمّی بیگم کے ساتھ کی تھی کیونکہ بقول سلامت بوا اس کالی کلوٹی نے انہیں اُلّو کا گوشت کھلا رکھا تھا۔

چھمّی بیگم کو جوں ہی ہوش آیا۔ آنکھیں کھولیں اور کلّو کا متفکر چہرہ سامنے دیکھا ان پر غم و غصّے کا بھوت سوار ہو گیا۔ کلّو ان کے پٹھانی جلال سے بیحد خوف زدہ تھی۔ فوراً کان دبا کر اپنے گھر واپس بھاگ گئی۔

بیشتر طوائفوں کی طرح، جو شادی کر کے بیحد وفاشعار بیویاں ثابت ہوتی ہیں، کلّو بھی بڑی پتی ورتا عورت تھی۔ اس کی سب سے بڑی تمنا یہی تھی کہ چھمّی بیگم اسے کنبے کی بہو اور اپنی بھاوج سمجھ کر اصلی والے مکان میں داخل کر لیں۔ اس کی تمنا کبھی نہ پوری ہوئی۔

دس سال نکل گئے۔ اجو بھائی کو چھمّی بیگم کے رشتے کی فکر بھی تھی لیکن چھمّی بیگم ادھیڑ ہو چکی تھیں۔ اب ان سے شادی کون کرے گا۔

چھمّی بیگم ان سے اور کلّو سے اسی طرح شدید پردہ کرتی تھیں۔ اسی طرح مدرسہ چلا کر

گزر کر رہی تھیں کہ ملک تقسیم ہو گیا۔ آدھا شاہجہاں پور سمجھو خالی ہو گیا۔ ان کے مکتب کی ساری لڑکیاں اپنے اپنے ماں باپ کے ساتھ پاکستان چلی گئیں۔ چھمّی بیگم کے ہاں روٹیوں کے لالے پڑ گئے۔ اسی زمانے میں شامت اعمال کہ کسی کام سے اجوّ بھائی دلی گئے اور فسادوں میں وہ بھی اللہ کو پیارے ہوئے۔ جب ان کی سناؤنی آئی کلو پچھاڑیں کھانے لگی۔ چوڑیاں توڑ ڈالیں۔ آنگن کی کھڑکی پر مکّے مار مار کر ہاتھ لہو لہان کر لیے --- "بٹیا! --- بٹیا! دروازہ کھولیے --- ہائے بٹیا --- بٹیا --- ارے میں کہیں کی نہ رہی!"

چھمّی بیگم دالان کے تخت پر بے خبر سو رہی تھیں۔ بین سن کر جاگ اٹھیں۔ دیوار کی کیل سے ٹنگی کنجی اتاری۔ تالا کھولا۔ کلو بال بکھرائے بھتنی کی طرح کھڑی چیخ رہی تھی۔ "ارے لوگو! میرا سہاگ لٹ گیا --- ہائے بٹیا میری مانگ اجڑ گئی!!" اس نے آگے بڑھ کر چھمّی بیگم سے لپٹنا چاہا۔ وہ دو قدم پیچھے ہٹ گئیں۔ نیند سے بوجھل آنکھیں ملیں اور اچانک ان کی سمجھ میں بات آ گئی۔ تب وہ بھی کھڑکی میں بیٹھ گئیں۔ سفید دوپٹہ منہ پر رکھ لیا۔ سسک سسک کر رونے لگیں۔ اور روتے روتے بولیں۔ "ارے مردار تو تو آج بیوہ ہوئی ہے۔ میں بد بخت تو سدا کی بیوہ ہوں۔"

اجو بھائی کے چالیسویں کے بعد ہی کلو نہ جانے کہاں غائب ہو گئی۔ اس کی لڑکی اشرفی جس کا چند سال پہلے اجو بھائی مرحوم نے اپنے کسی مصاحب سے نکاح کروا دیا تھا، لکھنؤ سے آئی اور چنبیلی والے مکان کے ساز و سامان پر قبضہ کیا اور سب چیزیں چھکڑوں پر لدوا کر چلتی بنی۔ چھمّی بیگم غسل خانے کے شیشے میں سے بے نیازی کے ساتھ فانی دنیا کے یہ سارے تماشے دیکھتی رہیں۔

چنبیلی والے مکان پر کسٹوڈین کا تالا پڑ گیا کیونکہ چھمّی بیگم عدالت میں یہ کسی طرح ثابت نہ کر پائیں کہ اجوّ بھائی پاکستان نہیں گئے بلوے میں مارے گئے ہیں۔ خود کسی پرانے آسیب کی طرح وہ املی والے مکان میں موجود رہیں۔ ملّن خاں اور دھمّو خاں دونوں بڑھاپے اور فاقہ کشی کی وجہ سے مر گئے۔ سلامت بوا پر فالج گر گیا۔ ان کی لڑکیاں اور داماد پاکستان چلے گئے۔ چھمّی بیگم سلائی کر کے پیٹ پالتی رہیں۔ تن تنہا مکان میں رہتے اب انہیں ڈر نہیں لگتا کیونکہ سر سفید

ہو چکا تھا۔ بہت جلد محلّے کی بڑی بوڑھی کہلائیں گی۔ کچھ عرصے بعد چنبیلی والے مکان میں ایک سکھ شرنارتھی ڈاکٹر آن بسے۔ کبھی کبھی سردارنیاں آنگن کی کھڑکی میں آن بیٹھتیں اور وہ اور چھمّی بیگم اپنے اپنے دُکھ سکھ کی باتیں کرتیں۔ ڈاکٹر صاحب کی لڑکی چرن جیت کی شادی نئی دہلی میں کسی سرکاری افسر سے ہوئی تھی۔

اب کی بار وہ میکے آئی تو اس نے اپنی ماں سے کہا کہ "اس کے شوہر کے مسلمان افسرِ اعلیٰ کی بیگم کو استانی کی ضرورت ہے جو گھر پر رہ کر ان کے بچوں کو اُردو اور قرآن پڑھائے۔ "میں تو چھمّی ماسی سے کہتے ڈرتی ہوں۔ انہیں جلال آجائے گا، آپ کہہ کر دیکھیے۔"

بڑی سردارنی نے چھمّی بیگم سے اس ملازمت کا ذکر کیا۔ سمجھایا بجھایا۔ "بہن جی اس تنگ دستی اور تنہائی میں کب تک بسر کرو گی۔ دلّی چلی جاؤ۔ صبیح الدین صاحب کے ہاں عزت و آرام سے بڑھاپا کٹ جائے گا۔"

چھمّی بیگم کا غصّہ کب کا دھیما پڑ چکا تھا۔ جوش و خروش، طنطنے اور جلال میں کمی آ گئی تھی۔ ان کی سمجھ میں بھی یہ بات آ گئی کہ اگر کل کلاں کو مر گئیں تو آخر وقت میں یٰسین شریف پڑھنے والا تو کوئی ہونا چاہیے۔

قصہ مختصر یہ کہ چھمّی بیگم برقع اوڑھ صرف ایک بکس اور بستر اور لوٹا ساتھ لے کر گھر سے نکلیں جو اب تک کھنڈر ہو چکا تھا اور جس کے کھنڈر ہونے کا اب انہیں قطعی غم نہ تھا کیونکہ وہ تیاگ اور سنیاس کی اسٹیج پر پہنچ چکی تھیں۔ وہ ریل میں بیٹھ کر دلّی پہنچیں جہاں ریلوے اسٹیشن پر بے چاری بیگم صبیح الدین چرن جیت سنگھ کا خط ملنے پر کار لے کر خود انہیں گھر لے جانے کے لیے آ گئی تھیں۔

اس روز سے چھمّی بیگم بنت جمعہ خاں زمیندار شاہجہاں پور مغلانی جی بن گئیں۔

چھمّی بیگم نے پورے بارہ سال سفید براق دوپٹہ ماتھے سے لپیٹے صبیح الدین صاحب کے گھر میں گزار دیے۔ بچے جنہیں وہ اردو اور قرآن شریف پڑھانے آئی تھیں بڑے ہو گئے۔ بڑا لڑکا بی اے کے بعد اپنے چچا کے پاس پاکستان بھیج دیا گیا۔ منجھلی لڑکی بھی کراچی چلی گئی۔ چھوٹی لڑکی کالج میں پہنچ گئی۔ اب بیگم صبیح الدین کو چھمّی بیگم کی ضرورت نہیں تھی۔ صبیح الدین

صاحب ریٹائر ہو کر اپنے وطن مرزاپور جانے والے تھے۔ دہلی سے روانہ ہونے سے پہلے بیگم صبیح الدین نے چھمّی بیگم کو اپنی دوست بیگم راشد علی کے ہاں رکھوادیا۔ راشد علی صاحب بھی حکومت ہند کے ایک اعلیٰ افسر تھے۔

چھمّی بیگم صبیح الدین صاحب کے ہاں بہت سکھ چین سے رہی تھیں۔ ان سے گھر کے بزرگوں کا سا برتاؤ کیا جاتا تھا۔ انہیں تینوں بچوں سے بیحد محبّت ہو گئی تھی۔ غصہ بھی بہت کم آتا تھا۔ اگر آتا بھی تو اپنی مجبوریوں کا خیال کر کے پی جاتی تھیں۔ اب وہ نخراد کھاتیں بھی کس پر۔ ناز اٹھانے، خفگی برداشت کرنے والے سب اللہ کو پیارے ہو چکے تھے۔ کبھی کبھی انہیں کلو کا خیال بھی آجاتا اور سوچتیں نہ جانے کمبخت اب کہاں اور کس حال میں ہو گی یا شاید وہ بھی مرکھپ گئی ہو۔ آج کل زندگیوں کا کیا بھروسہ ہے۔

بیگم راشد علی بیگم صبیح الدین کی طرح درد مند اور دیندار خاتون تو نہ تھیں۔ آج کل کی ماڈرن لڑکی تھیں لیکن عزت انہوں نے بھی چھمّی بیگم کی بہت کی۔ یہاں بھی وہ گھر کے فرد کی حیثیت سے رہتیں۔ راشد علی ان کا بہت خیال رکھتے۔ ان کی بارُعب، پُروقار شکل و صورت اور اعلیٰ نسبی سے سب ہی متاثر تھے۔ بیگم راشد اکثر سہیلیوں سے کہتیں۔ ”بھئی واقعی زندگیوں میں کیسے کیسے انقلاب آتے ہیں۔ پل کی پل میں کیا سے کیا ہو جاتا ہے۔ ہماری مغلانی بی کا قصہ سنا ہے آپ نے؟ شاہجہاں پور کے فلاں خاندان......“ اور سننے والی خواتین سر ہلا کر ٹھنڈی سانسیں بھرتیں اور دوسرے اسی طرح کے عبرت انگیز نصیحت آموز واقعات سناتیں۔

بیگم راشد علی کے بچے بہت خورد سال تھے۔ ان پر حیدر آبادی ”آیا ماماں“ مامور تھیں۔ چھمّی بیگم ہاؤس کیپر بن گئیں۔ گھر سنبھالنے کے لیے بیگم راشد کو چھمّی بیگم کی بیحد ضرورت تھی کیونکہ ان کا اپنا وقت زیادہ تر کلبوں، پارٹیوں اور سرکاری تقریبات میں گزرتا تھا۔

پانچ برس چھمّی بیگم نے راشد علی صاحب کے گھر میں کاٹ دیے۔ جب راشد صاحب کا تبادلہ ہندوستانی سفارت خانے واشنگٹن ہونے لگا، ان کی بیگم کو فکر ہوئی کہ چھمّی بیگم کا کہیں اور ٹھکانہ بنائیں۔ ایک دن وہ اپنے ایک الوداعی لنچ کے لیے روشن آرا کلب گئی ہوئی تھیں اور چھمّی بیگم سے کہتی گئی تھیں کہ فلاں وقت کار لے کر منّی کو میرے پاس لے آیئے گا۔

جب چھمی بیگم روشن آرا کلب پہنچیں لنچ ابھی ختم نہ ہوا تھا۔ چھمی بیگم بچی کی انگلی پکڑے سبزے پر ٹہلتی رہیں۔ چھمی بیگم اب پردہ نہیں کرتی تھیں اور ساڑھی پہنتی تھیں۔ اس نگوڑی دلّی میں انھیں پہچاننے والا کون رکھا تھا۔ سامنے برآمدے میں ایک طرف رمی کی محفل جمی ہوئی تھی اور ایک بیحد فیشن ایبل چالیس پینتالیس سالہ حقاقہ، دقاقہ خاتون پانچ چھ مَردوں کے ساتھ قہقہے لگا لگا کر تاش کھیلنے میں مصروف تھیں۔

سترہ برس نئی دلّی میں رہ کر چھمّی بیگم اس نئی ''اعلیٰ سوسائٹی'' اور جدید ہندوستانی خواتین کی الٹرا ماڈرن طرزِ زندگی کی بھی عادی ہو چکی تھیں اس لیے چھمّی بیگم اطمینان سے گھاس پر ٹہلا کیں۔ چند منٹ بعد اس خاتون نے سر اٹھا کر چھمّی بیگم کو ذرا غور سے دیکھا۔ کچھ دیر بعد پھر نظر ڈالی اور اپنے ایک ساتھی سے کچھ کہا تب چھمّی بیگم نے دیکھا ایک مرد تاش کی میز سے اُٹھ کر لمبے لمبے ڈگ بھرتا ان کی طرف آرہا ہے۔

قریب آ کر اس نے کہا ''بڑی بی! ذرا اِدھر آیئے۔''

چھمی بیگم متانت سے برآمدے میں پہنچیں۔ اجنبی خاتون نے پوچھا یہ بچی کس کی ہے اور وہ کس کی ملازمہ ہیں؟ چھمّی بیگم نے بتایا۔ خاتون نے کہا کہ وہ بمبئی میں رہتی ہیں اور آج کل انہیں بھی ایک قابل اعتبار بڑی بی کی تلاش ہے۔ اگر وہ اپنی جیسی کسی بڑی بی کو جانتی ہوں تو بتائیں۔ چھمّی بیگم فوراً دل میں اس رب کریم کا لاکھ لاکھ شکر بجالائیں جو رزق کا ایک دروازہ بند کرتا ہے تو دوسرا کھول بھی دیتا ہے۔ پھر انہوں نے اسی وقار سے جواب دیا کہ وہ خود بہت جلد اپنی ملازمت سے سبکدوش ہونے والی ہیں۔ ''میری بیگم ابھی باہر آتی ہوں گی۔ ان سے بات کر لیجئے۔'' اتنا کہہ کر وہ بیگم راشد کے انتظار میں وہیں برآمدے کے ایک در میں ٹک گئیں۔ جب بیگم راشد لنچ روم سے نکلیں تو میز سے اٹھ کر اجنبی خاتون نے فوراً اپنا تعارف کرایا۔ اپنا نام مسز رضیہ بانو بتایا اور چھمّی بیگم کے متعلق ان سے بات کی۔ بیگم راشد بھی بہت خوش ہوئیں اور وعدہ کیا کہ واشنگٹن روانہ ہونے سے پہلے وہ چھمّی بیگم کو خود بمبئی کی ریل میں بٹھا دیں گی۔ رضیہ بانو نے بتایا تھا کہ وہ آج شام ہی بمبئی واپس جا رہی ہیں۔ اپنے گھر کا پتہ لکھ کر انہوں نے چھمّی بیگم کو دے دیا لیکن بیگم راشد نے ذرا متفکر ہو کر پوچھا۔ ''خالہ تم اکیلی اتنی دور

کا سفر کر لو گی؟" چھمی بیگم نے فوراً اقرار میں سر ہلا دیا۔ چھمیّ بیگم کو اب زندگی میں کسی بات کے لیے "نہیں" کہنے کی ضرورت ہی نہ رہی تھی۔ انہوں نے رضیہ بانو سے تنخواہ کا فیصلہ بھی نہ کیا۔ کیونکہ انہوں نے ہمیشہ کے لیے ایک تنخواہ مقرر کر لی تھی۔ چالیس روپے ماہوار اور کھانا۔ یہ چالیس روپے ان کی ضرورت کے لئے ضرورت سے زیادہ تھے۔ کپڑے ہمیشہ انھیں اپنی بیگموں سے مل جاتے تھے۔ عرصہ ہوا انہیں معلوم ہو چکا تھا کہ کپڑے لتے، گہنے پاتے، جائداد املاک، رشتے ناطے، دوستی محبت، سب بے معنی اور فانی چیزیں ہیں۔

بیگم راشد علی اور چھمیّ بیگم برآمدے سے اترنے لگیں تو رضیہ بانو نے بیگ کھول کر فوراً ڈیڑھ سو روپے کے نوٹ نکال کر چھمیّ بیگم کے حوالے کر دیے۔ "سفر خرچ اور دوسرے اخراجات۔" انہوں نے ذرا بے پروائی سے کہا۔ بیگم راشد کو اس دریادلی پر حیرت ہوئی لیکن انہیں خود معلوم تھا کہ بمبئی میں ایک سے ایک بڑی سیٹھانی بستی ہے چھمیّ بیگم نے خاموشی سے نوٹ صدری کی جیب میں اڑس لیے۔ انہوں نے اب زندگی کے انوکھے واقعات پر متعجب ہونا بھی چھوڑ دیا تھا۔

مسٹر و مسز راشد علی کے امریکہ روانہ ہونے سے دو دن پہلے چھمیّ بیگم نے بھی ٹرین میں سوار ہو کر بمبئی کا رُخ کیا۔

بمبئی سینٹرل پہنچ کر وہ پہلی بار ذرا گھبرائیں کیونکہ دلّی کی پر سکون کوٹھیوں میں انہوں نے اب تک بہت محفوظ اور مامون زندگی گزاری تھی۔ اللہ کا نام لے کر پلیٹ فارم سے باہر نکلیں۔ قلی کے سر سے اپنا ٹین کا بکس اور دری میں لپٹا بستر اتروایا۔ اپنا لوٹا، دستی پنکھا اور پندنیا ہاتھوں میں سنبھال کر ٹیکسی کی۔ سردار جی کو پتہ بتایا۔ "گلزار، جاڈن روڈ۔"

چند منٹ میں ٹیکسی ایک بلند و بالا نئی عمارت کی برساتی میں جا کر رُکی۔ چھمیّ بیگم نے بوڑھے سردار جی کو کرایہ دیا جو راستے میں ان سے دنیا کے حالات پر تبادلۂ خیالات کرتے آئے تھے۔ اسی وقت دو بیحد اسمارٹ لڑکیاں لفٹ سے نکل کر سردار جی کی ٹیکسی میں بیٹھ گئیں۔ سردار جی نے خاموشی سے فلیگ گرایا اور پھاٹک سے باہر نکل گئے۔ کس قدر غیر شخصی، منظم اور میکینکل زندگی اس شہر کی تھی۔

چھمی بیگم نے صدری کی جیب سے میلا کاغذ کا ٹکڑا نکال کر پھر آنکھیں چندھیائیں اور پتہ پڑھا، گیارھویں منزل فلیٹ ۳۔ سٹول پر بیٹھے چوکیدار نے اکتائے ہوئے انداز میں خاموشی سے اٹھ کر ان کا سامان لفٹ میں رکھ دیا۔ لفٹ آٹومیٹک تھا چھمی بیگم بہت گھبرائیں چوکیدار جلدی سے اندر آیا اور انھیں گیارھویں فلور تک پہنچا کر واپس نیچے چلا گیا۔ اب چھمی بیگم اپنے سامان سمیت طویل گیلری میں اکیلی کھڑی تھیں۔ پھر ان کی نظر ایک نزدیکی دروازے پر پڑی جس کے اوپر نمبر ۳ لکھا تھا۔ دروازے پر ایک اور آہنی جالی دار دروازہ چڑھا تھا جو اندر سے مقفل تھا جیسے بنکوں کے دروازے ہوتے ہیں۔ چھمی بیگم نے آگے بڑھ کر گھنٹی بجائی۔ چند لمحوں بعد ایک بھوری آنکھ نے اندرونی کواڑ کے جالی دار سوراخ کا پٹ ہٹا کر جھانکا۔ چھمی بیگم کو دفعتہً برسوں بعد اپنے غسل خانے کی کھڑکی کا کھرچا ہوا شیشہ یاد آگیا جس میں سے انہوں نے پہلی بار اس منحوس لال چڑیل کو دیکھا تھا۔ مزید توقف کے بعد دونوں دروازے کھلے اور ایک غصیلا سا گورکھا باہر نکلا۔ اس نے مشکوک اور بے رحم نظروں سے چھمی بیگم کو دیکھا۔ چھمی بیگم ڈر سی گئیں لیکن پھر یاد آیا وہ بھی پٹھان ہیں۔ سر اٹھا کر وقار سے کہا "بیگم صاحب سے کہو چھمی بیگم دلی سے آگئی ہیں۔"

"مالوم ہے۔ تم دلی سے آیا ہے، اندر آجاؤ۔" گورکھے نے خشکی سے جواب دیا اور باہر نکل کر ان کا بکس بستر اٹھالیا۔ اس کے پیچھے پیچھے چھمی بیگم اندر آگئیں تو اس نے کھٹ سے دونوں دروازے مقفل کردیے۔

اب چھمی بیگم ایک نیم تاریک، ایر کنڈیشنڈ عالی شان ڈرائنگ روم میں کھڑی تھیں۔ ایسا شاندار ڈرائنگ روم تو نہ بیچارے صبیح الدین صاحب کا تھا اور نہ راشد علی صاحب کا۔ ایک طرف کی دیوار پر سیاہ پردہ پڑا تھا جو ذرا سا سرکا ہوا تھا اور اس کے پیچھے دیوار میں نصب سینما کی چھوٹی سی اسکرین نظر آرہی تھی۔ کمرے کے دوسرے حصے میں بار تھی۔

"بیگم صاحب ہیں؟" چھمی بیگم نے دونوں ہاتھوں میں لوٹا، پندنیا اور پنکھا اٹھائے اٹھائے دریافت کیا۔

"میم صاحب سو رہا ہے۔"

''اور صاحب؟'' ملازمت شروع ہونے سے پہلے گھر کے صاحب کے انٹرویو سے وہ ہمیشہ جھجکتی تھیں۔

گورکھے نے کوئی جواب نہ دیا اور ڈرائنگ روم سے نکل کر ایک گیلری کی طرف چلا۔ چھمی بیگم اس کے پیچھے پیچھے دونوں طرف دیکھتی ہوئی، گیلری میں دو رویہ چار دروازے تھے جو سب اندر سے بند تھے۔ یہ بہت بڑا اور پرشکوہ فلیٹ تھا۔

آگے جاکر گیلری بائیں طرف کو مڑ گئی تھی۔ یہاں باورچی خانہ اور نوکروں کے دو مختصر سے کمرے تھے جن کے باہر بالکنی تھی۔ نوکروں کے استعمال والے زینے میں بھی اندر سے تالا پڑا تھا۔ ایک صاف ستھری اور روشن خالی کوٹھری میں جاکر گورکھے نے بکس بستر ادھم سے زمین پر رکھ دیا اور اسی طرح چپ چاپ باہر چلا گیا۔

چھمی بیگم نے پندنیا بڑے طاق کے تختے پر رکھ کر اپنی نئی جائے پناہ، نئے ٹھکانے پر نظر ڈالی۔ کونے میں لوہے کا ایک پلنگ پڑا تھا۔ انہوں نے دل میں سوچا یہ بہت چبھے گا۔ دیواروں پر پچھلے شوقین مزاج ملازم کی چپکائی فلم ایکٹریسوں کی تصویریں مسکرا رہی تھیں۔ کوٹھری میں حبس طاری تھا۔ چھمی بیگم نے کھڑکی کھولی تو اچانک سمندر آنکھوں کے سامنے آگیا۔ نیلا، وسیع، بیکراں سمندر ٹھاٹھیں مارتا، غیر متوقع، زندگی کے واقعات کی مانند اچانک۔ انہوں نے سمندر پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ دفعتاً خیال آیا اس کارساز کے قربان جاؤں۔ سمندر تک پہنچ گئی۔ اب انشاءاللہ حج بھی کر آؤں گی۔ اسی سمندر کے اس پار مکہ مدینہ ہے۔ یہ سوچ کر ان کا جی بھر آیا۔

کوٹھری سے ملحق نوکروں کا غسل خانہ تھا۔ چھمی بیگم نے بکسا کھولا، کپڑے نکالے، غسل خانے میں گئیں۔ اپنے آبائی مکان کا وہ طویل و عریض نیم تاریک غسل خانہ، مامائیں، اصیلیں وہ برسوں کی کوشش کے بعد بھلا چکی تھیں کہ انسان زندگی کی پیہم تبدیلیوں کا عادی ہوتا چلا جاتا ہے ورنہ مر جائے۔

نہا دھو، کپڑے بدل وہ پھر اپنی کوٹھری میں آئیں۔ سارا گھر سنسان پڑا تھا۔ اب انھیں چائے کی طلب ستانے لگی۔ ساری عمر شدید ذہنی اور جذباتی صدمے سہتے رہنے سے چھمی بیگم کی تیزی طراری کب کی ہوا ہو چکی تھی اور وہ بڑھاپے کی وجہ سے سٹری بہتری بھولی بھگی ہو کر

بھی رہ گئی تھیں۔ سادگی سے سوچا اب کچن میں جا کر چائے بناؤں۔

سنسان باورچی خانے میں پہنچیں تو وہاں گیس کے چولھے نظر آئے جو استعمال کرنا نہ جانتی تھیں۔ ذرا جھنجھلا کر گیلری میں آئیں جس کے چار دروازوں میں سے ایک کھل چکا تھا اور اس پر پڑا بیش قیمت پردہ دکھائی دے رہا تھا۔

ان کے قدموں کی چاپ سن کر پردے کے پیچھے سے کسی نے آواز دی۔

"کون ہے؟"

"چھمّی بیگم --- دلّی سے آئی ہوں۔" انھوں نے اسی سادگی سے جواب دیا۔

"اوہو --- آ گئیں، آؤ آ جاؤ۔"

پردہ سرکا کر اندر گئیں۔ ایک بالکل شاہانہ خواب گاہ میں وسیع و عریض امریکن چھپر کھٹ پر رضیہ بانو گلابی نائیلون کا نائٹ گون پہنے نیم دراز تھیں۔ انگلیوں میں سگریٹ سلگ رہا تھا۔ چھمّی بیگم کو ان کا یہ ننگا پہناوا ذرا بھی پسند نہ آیا۔ لیکن سوچا بھئی اپنا اپنا دستور ہے اس شہر کے یہی رنگ ڈھنگ ہیں۔ رضیہ بانو کا سگریٹ بھی انھیں اچھا نہ لگا۔ بیگم صبیح الدین اور بیگم راشد دونوں سگریٹ نہیں پیتی تھیں۔ بہر حال انھوں نے بردباری سے کہا۔ "السلام علیکم"

"آ جاؤ...... بوا بیٹھو۔" رضیہ بانو نے فرش کی طرف اشارہ کیا۔

جب سے چھمّی بیگم برقعہ سر پر ڈال کر حق حلال کی روزی کمانے باپ دادا کی دہلیز سے باہر نکلی تھیں آج تک انھیں کسی نے بوا نہیں کہا تھا۔ صبیح الدین صاحب اور راشد صاحب دونوں کے ہاں انھیں چھمّی خالہ یا صرف خالہ کہہ کر پکارا جاتا تھا۔ وہ تمکنت سے دیوان کے کنارے پر ٹک گئیں۔

رضیہ بانو کے سرہانے دو ٹیلی فون رکھے تھے۔ ایک سفید ایک سرخ۔ سفید والے کی گھنٹی بجی۔ رضیہ بانو نے ریسیور اٹھا کر انگریزی میں آہستہ آہستہ کچھ باتیں کیں۔ ہاتھ بڑھا کر سائڈ ٹیبل سے ایک بڑی سی مجلد نوٹ بک اٹھائی، اس میں کچھ لکھا پھر ریسیور رکھ کر سرخ رنگ کے ٹیلیفون کا ایک نمبر ملایا اور آہستہ سے کہا۔ "مادھو --- چار نمبر --- نائن تھرٹی۔" اور فون بند کر دیا چھمّی بیگم خاموش بیٹھی کمرے کی آرائش دیکھتی رہیں۔ مرمریں مجسمے، بڑی بڑی

تصویریں، ریڈیوگرام، طول طویل سفید رنگ کا وارڈروب۔ اتنے میں پردہ سرکا کر ایک طرحدار لڑکی ہاؤس کوٹ پہنے اندر آئی۔ گیلری کے بند دروازوں میں سے ایک کھلا۔ کمرے میں سے زور سے 'ہائی فائی' کی آواز سنائی دی۔ لڑکی نے رضیہ بانو سے کچھ گٹ پٹ کی اُلٹے پاؤں واپس گئی اور گیلری والا دروازہ پھر بند ہو گیا۔

"اللہ رکھے کتنے بچے ہیں؟" چھمی بیگم نے دریافت کیا۔

"میرے ہاں کوئی اولاد نہیں۔ یہ میری بھانجیاں ہیں، میرے ساتھ رہتی ہیں۔" رضیہ بانو نے مختصر اُجواب دے کر پھر مجلد نوٹ بک کھول لی۔

"کالج میں پڑھتی ہوں گی۔" چھمی بیگم نے کہا۔

"کون؟" رضیہ بانو نے بے خیالی سے پوچھا۔

"بھانجیاں آپ کی۔"

"ہُوں۔"

"اللہ رکھے آپ کے میاں بزنس کرتے ہیں؟" چھمی بیگم کو معلوم تھا کہ بمبئی میں سب لوگ بزنس کرتے ہیں۔

"ہیں---کیا---؟" رضیہ بانو نے نوٹ بک سے سر اٹھا کر ذرا ناگواری سے پوچھا۔

"میاں؟---میاں مر گئے۔"

"اناللہ وانا الیہ راجعون۔" چھمی بیگم کے منہ سے نکلا۔ لحظہ بھر کے لیے اجو بھائی اللہ بخشے کی موت کا زخم پھر ہرا ہو گیا۔ ہر موت کی خبر پر ہرا ہو جاتا تھا۔ کوئی کیا جان سکتا تھا کہ چھمی بیگم نے اپنی ساری عمر کیسے بے پایاں اندوہ میں مبتلا رہ کر اسے کس طرح ضبط کر کے گزار دی۔ صبر شکر۔ صبر شکر۔

چوڑی دار پاجامہ پہنے ایک اور مجسم قیامت نوجوان لڑکی لہراتی، بل کھاتی کمرے میں آئی۔ رضیہ بانو نے اس سے انگریزی میں کچھ کہا۔ لڑکی اسی طرح لہراتی مسکراتی باہر چلی گئی۔ اب رضیہ بانو چھمی بیگم کی طرف متوجہ ہوئیں جنھیں چائے کی طلب میں جمائیاں آنے لگی تھیں۔ رضیہ بانو نے ایک تکیہ کہنیوں کے نیچے دبا کر کہنا شروع کیا۔ "بوا (چھمی بیگم پھر

کلبلائیں) آپ نے بہت اچھا کیا جو میرے ہاں آگئیں۔ میں نے پہلی نظر میں اندازہ لگا لیا تھا کہ آپ بے سہارا اور دُکھی ہیں۔ اب آپ اس گھر کو اپنا گھر سمجھیے۔ میں ہمیشہ یہ چاہتی ہوں کوئی بزرگ بی بی میرے گھر میں نماز قرآن پڑھتی رہا کریں۔ برسوں سے میرے پاس ایک حیدر آبادی بڑی بی تھیں۔ وہ پچھلے سال بے چاری حج کرنے گئیں وہیں انتقال ہو گیا---

اچھا۔" رضیہ بانو نے پہلو بدل کر بات جاری رکھی۔ "میں اب آپ کو بتانا یہ چاہتی ہوں بوا کہ یہ بمبئ شہر میدانِ حشر ہے۔ طرح طرح کی باتیں، طرح طرح کے لوگ۔ آپ کسی بات پر کان نہ دھریے۔ بس اپنے کام سے کام رکھیے۔ کچن کی نگرانی کر لیجئے۔ باقی وقت اپنے نماز روزے میں گذاریے۔ اب آپ کے لیے محنت کا نہیں آرام کا وقت ہے۔ قرآن شریف پڑھیے۔ میرے حق میں دُعائے خیر کرتی رہیے۔ باقی یہ کہ لڑکیوں--- میری بھانجیوں کے لیے دوسری آیا موجود ہے۔ ابراہیم خانساماں کا نام ہے۔ بشن سنگھ گورکھا ہے۔ مادھو میرا ڈرائیور ہے--- لیکن کسی کے جھگڑوں قضیوں میں نہ پڑیے۔"

"میں خود---" چھمّی بیگم نے کہنا چاہا۔ لیکن رضیہ بانو نے ان کی بات کاٹی۔

"میری اللہ کے فضل سے بہت بڑی بزنس ہے۔" کچھ توقف کے بعد اضافہ کیا۔

"ایکسپورٹ امپورٹ جانتی ہیں ایکسپورٹ امپورٹ؟"

"جی ہاں۔" چھمّی بیگم نے سر ہلایا۔ صبیح الدین صاحب محکمۂ تجارت کے افسر تھے اور اس طرح کے الفاظ چھمّی بیگم کے کانوں میں پڑتے رہتے تھے۔ رضیہ بانو چھمّی بیگم کو بہت سمجھ دار اور نیک بی بی معلوم ہوئیں اور اس قدر خدا پرست۔ چھمّی بیگم نے ان کا بار یک نائٹ گاؤن اور سگریٹ نوشی معاف کر دی۔

"میں عورت ذات تن تنہا اتنا بڑا کاروبار چلا رہی ہوں۔ اس کی وجہ سے دس طرح کے لوگوں سے ملنا پڑتا ہے۔ بھانجیاں بھی آج کل کی لڑکیاں ہیں۔ ان کے دوست احباب بھی آتے جاتے رہتے ہیں۔ پھر میری بزنس کی وجہ سے دو مرتبہ پولیس ریڈ کر چکی ہے۔"

"پولیس؟" چھمّی بیگم نے ذرا دہل کر دہرایا۔

رضیہ بانو ہنس پڑیں "ڈریے نہیں۔ یہاں بڑے بڑے تاجروں کو پولیس اور انکم ٹیکس

والے اکثر پریشان کرتے ہیں۔ میں اکیلی عورت، دسیوں دشمن پیدا ہو گئے۔ کسی نے جا کر پولیس والوں سے جڑ دی کہ میں نے انکم ٹیکس نہیں دیا ہے، بس دوڑ آ گئی۔ اسی وجہ سے میں نے باہر لوہے کا دروازہ لگوا لیا ہے، تو اب آپ سے کہنا یہ ہے کہ جب باہر کی گھنٹی بجے تو آپ پہلے سوراخ میں سے دیکھ کر اطمینان کر لیجیے۔ کبھی کبھی یہ پولیس والے سادہ کپڑوں میں بھی آ جاتے ہیں۔"

چھمی بیگم سفر کی تکان اور چائے کی طلب میں نڈھال ہوئی جا رہی تھیں۔ اُٹھ کھڑی ہوئیں اور بولیں۔ "بی بی گیس کا چولھا کیسے جلتا ہے۔"

رضیہ بانو نے سرہانے ایک برقی بٹن دبایا۔ ایک منٹ میں ابراہیم باورچی دروازے میں نمودار ہو گیا۔

"ابراہیم! یہ ہماری نئی بُوا ہیں۔ ان کے لیے چائے تو بنا دو جھٹ پٹ!"

چھمی بیگم جلدی سے اٹھ کر ابراہیم کے پیچھے پیچھے کچن کی طرف روانہ ہو گئیں۔

ظہر، عصر، مغرب ساری نمازیں پڑھ کر وہ پھر بالکنی میں جا کھڑی ہوئیں۔ گھر میں کرنے کے لیے کچھ کام ہی نہ تھا۔ رضیہ بانو بن سنور کر باہر جا چکی تھیں۔ دو "بھانجیوں" کے کمروں میں روشنی جل رہی تھی۔ تیسری بھانجی غائب تھی۔ تینوں چاروں ملازم بھی فلیٹ میں نہ تھے۔ اس لیے گھنٹی بجی تو بجتی ہی چلی گئی۔ چھمی بیگم نئی دلّی کی عادت کے مطابق فوراً دروازہ کھولنے کے لیے ڈرائنگ روم کی طرف لپکیں اور جلدی سے اندر والا دروازہ کھول دیا۔ باہر کا آہنی دروازہ اس وقت پہلے سے ایک طرف کو سرکا ہوا تھا اور جس طرح صبیح الدین صاحب اور راشد صاحب کی کوٹھیوں میں ڈرائنگ روم کی دہلیز پر آ کر وہ مہمانوں سے بہت اخلاق سے کہتی تھیں۔ "تشریف لائیے" اسی عادت کے مطابق انھوں نے اخلاق سے کہا۔ "تشریف لائیے۔"

دو فربہ مارواڑی اور ایک معطر نوجوان امیر زادہ اندر داخل ہوئے۔ امیر زادہ سیدھا بار کی طرف چلا گیا۔ فربہ مارواڑی دھم سے ایک صوفے پر بیٹھ گئے۔ صبیح الدین صاحب کے ہاں بھی اکثر اس وضع قطع کے کاروباری اپنی غرض سے آیا کرتے تھے۔ معطر نوجوان کو دیکھ کر البتہ ذرا تعجب ہوا۔ پھر سوچا اس شہر کا یہی دستور ہوگا۔ ابھی وہ یہی طے کر رہی تھیں کہ معزز مہمانوں سے چائے کے لیے پوچھیں یا کافی کے لیے کہ سونے کے بٹنوں اور ہیرے کی

ہندوستان و پاکستان کے افسانے

اس افسانوی انتخاب میں ہندوپاک کے پندرہ معروف و ممتاز افسانہ نگاروں کے نہایت تاثر آگیں اور قابلِ مطالعہ افسانے شامل ہیں۔

۱۹۴۷ء میں ہمارا برصغیر دو کوری زندگیوں میں ڈھل آیا۔ اِس اثنا میں اردو میں نت نئی کہانیاں جنم لیتی رہیں اور اِن کہانیوں میں 'تب اور اب' کو مڑ مڑ کر دیکھنے اور سمجھنے کا عمل جاری رہا۔ اِس مجموعے کی کہانیاں اِسی تناظر میں ہماری سماجی اور تہذیبی زندگی کے تسلسل کی تصویر کشی کرتی ہیں اور از حد متنوع ہیئت اور مواد کے باعث قاری کو مختلف النوع برصغیری سطحوں تک رسائی کا موقع بہم پہنچاتی ہیں۔

اردو افسانے کے نئے تانے بانے کی تازہ کار فنی شکلیں ہمعصر زندگی کی اُفقی اور عمودی حرکات پر بہ کمال حاوی ہیں اور اِسی لیے لاہور یا سیالکوٹ اور لکھنؤ یا شاہجہاں آباد کی گوناگوں گھتّیوں کو یکساں چابکدستی سے اپنی بُنت میں سمیٹ لیتی ہیں۔ کچھ ایسے ہی اِن منتخب کہانیوں نے بھی مشترکہ برصغیری تہذیب کی کثیر الجہتی کا بڑا کارگر سماں باندھ دیا ہے۔

Rs 175
ISBN 81-85586-77-2